زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات
زر پرست
مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)

2001ء

ناشر محمد علی قریشی نے نیر اسد پریس سے چھپوا کر
القریش پبلی کیشنز لاہور سے شائع کی۔

قیمت =/90 روپے
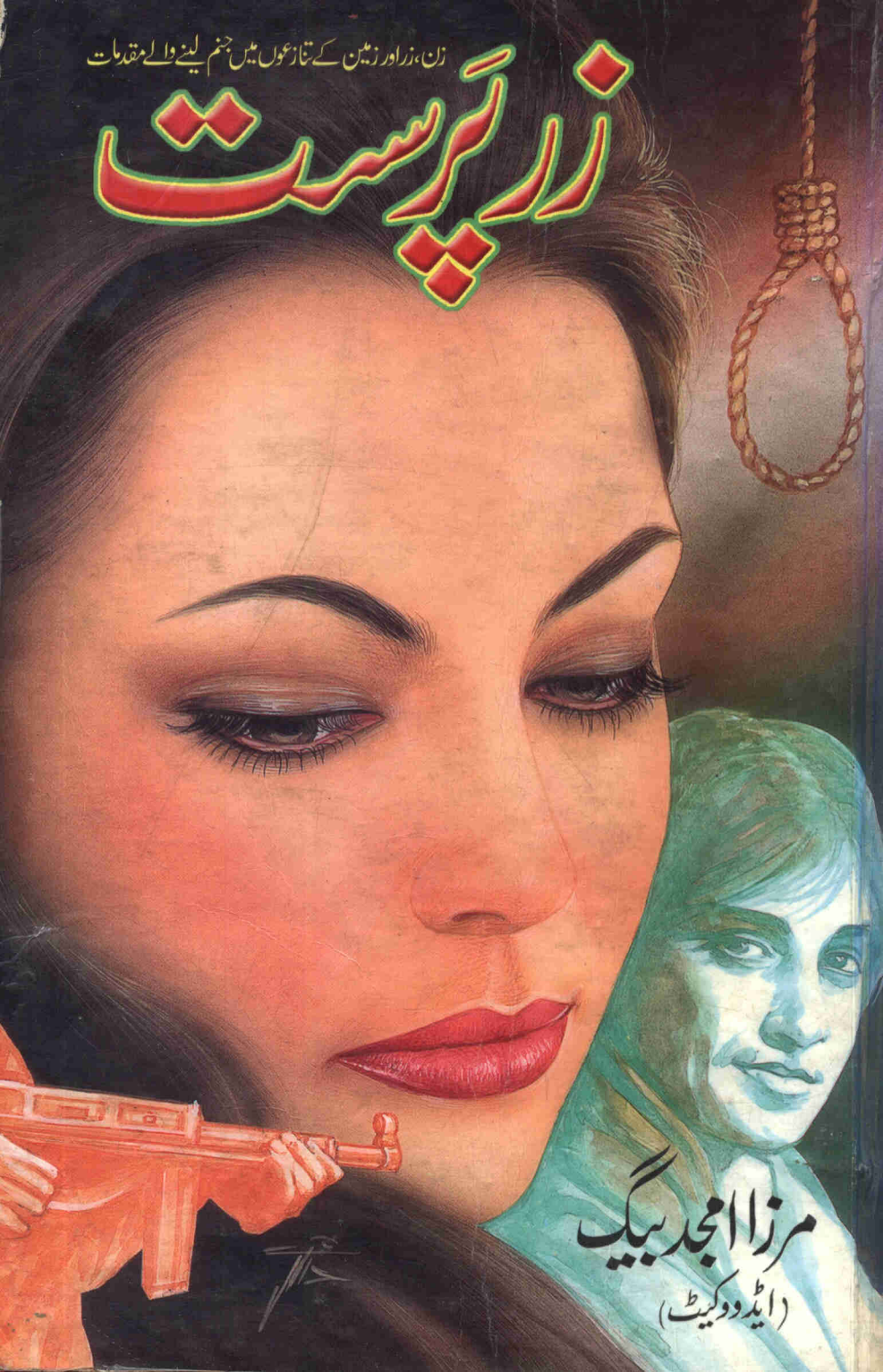
رہ و رسم آشنائی

مستقل کرداروں کے حوالے سے کہانی لکھنے کی روایت بڑی پرانی ہے۔ غیر ملکی ادب میں شرلاک ہومز، وکیل پیر میسن اور مشہور چور نک ویلوٹ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اردو ادب بھی اس روایت سے کبھی خالی نہیں رہا۔ خصوصاً اردو کے نثری ادب میں مرحوم ابن صفی کے تخلیق کردہ کرداروں نے بڑی دھوم مچائی۔ ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ڈائجسٹ پرچے اپنی ابتدا میں غیر ملکی ادب پر بہت انحصار کرتے تھے۔ لہٰذا شرلاک ہومز، وکیل پیری میسن اور نک ویلوٹ جیسے کردار ڈائجسٹوں کے ذریعے اردو قارئین تک بھی پہنچ گئے۔ اور ایسے مقبول ہوئے کہ پھر ان کی شمولیت کے بغیر پرچہ ہی پھیکا لگنے لگا۔ مگر یہ غیر ملکی مواد آخر کہاں تک ساتھ دیتا۔ چنانچہ جب غیر ملکی ادب سے ان مستقل کرداروں کی تمام کہانیاں صاف ہو گئیں تو مدیران گرامی قدر کو اپنے قارئین کے فزوں تر شوق کی خاطر نئے کرداروں کی تلاش ہوئی اور یوں ڈائجسٹوں میں بھی مستقل کرداروں پر طبع زاد کہانیاں لکھنے کا رواج ہوا۔

ابتدا میں بعض سرکاری محکموں کے ریٹائرڈ افسران نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل زندگی کے تجربات و مشاہدات سے سچی کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر بعض کہنہ مشق مصنفین نے ایسے ریٹائرڈ افسران سے رابطہ کر کے ان کی یادداشتیں قلم بند کرنا شروع کر دیں۔ مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ اور ملک صفدر حیات صاحب کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے جن کی زندگی کے تجربات و مشاہدات دوسرے مصنفین کے ذریعے عوام تک پہنچے۔ مذکورہ بالا حضرات کا رابطہ جناب عبدالقیوم شاد سے رہا اور ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری برادرم حسام بٹ کے سر آئی۔ شاد صاحب بڑے کہنہ مشق اور پختہ کار کہانی نویس تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی تک اس ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی ادا کیا اور قارئین سے خوب داد و تحسین پائی۔ ان کے مقابلے میں حسام بٹ کے لئے یہ ایک بھاری پتھر تھا۔ اور خدشہ تھا کہ وہ اسے چوم کر ہی نہ چھوڑ دیں۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ شاد صاحب کے سچے جانشین ہیں۔ اور ان تمام رسموں اور روایتوں کی پاس داری کر سکتے ہیں، جن کی بنیاد شاد صاحب رکھ گئے تھے۔ گزشتہ چار سال سے وہ یہ ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ مگر کبھی کسی پڑھنے والے نے یہ شکایت نہیں کی کہ اب وہ شاد صاحب کی تحریر والا

مزہ نہیں رہا۔ یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

مرزا امجد بیگ اور ملک صفدر حیات کی کہانیاں ہمارے اسی معاشرے کی کہانیاں ہیں جس میں حرص و ہوس کے پھندے قدم قدم پر موجود ہیں اور انسان کے لئے پاؤں بچا کر چلنا کوئی آسان کام نہیں۔ ساتھ ہی معاشرتی ناہمواریوں کے وہ اتار چڑھاؤ بھی ہیں جو کسی بھی انسان کی زندگی کو جہنم بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان حالات کی انہی ستم ظریفیوں کے درمیان اپنی منزل کا تعین کر کے قدم آگے بڑھاتا ہے۔ یہ کہانیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ اس نے کب کون سا قدم درست سمت میں بڑھایا اور کب وہ غلط راستے پر چل نکلا۔ درست سمت میں اٹھنے والے قدم کے فوائد سے یہ آگاہ کرتی ہیں اور غلط روی کے انجام سے باخبر۔ دوسرے الفاظ میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ دلچسپ اور عبرت اثر داستانیں خیر و شر کی ازلی کشمکش سے عبارت ہیں اور ان میں تفریحی پہلو کے ساتھ ساتھ اصلاح معاشرہ کا بھرپور سبق موجود ہے۔ اب یہ پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اس سبق کو ذہن نشین کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے۔ مصنف کا کام تو بس اتنا ہی ہے کہ وہ خیر و شر کے جملہ نتائج و عواقب سے اپنے قاری کو آگاہ کر دے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے اسے اپنے موضوعاتی تنوع اور انداز بیان کی انفرادیت کے سبب 'اردو زبان کے معاشرتی ادب میں ایک گراں قدر اور دلچسپ اضافہ تصور کریں گے۔

سید انور فراز

ترتیب

پتلی گردن

نجومی نے خراب وقت کی پیش گوئی کر کے اسے اذیت سے دو' چار کر دیا تھا۔ دو چار روز کی بات ہوتی تو کوئی بات نہ تھی وہ احتیاط کی راہ اختیار کر کے اپنا دفاع کر لیتا' تدبیر سے تقدیر کو بدل دیتا مگر نجومی نے کوئی حتمی بات نہیں کی تھی۔ صرف اتنا کہہ کر اسے الجھاوے میں ڈال دیا تھا۔ "ملک صاحب! ساڑھ ستی کا آخری مرحلہ بڑا خوفناک ہوتا ہے' جان لیوا عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مصیبت دستک دے کر نہیں آتی۔ وہ بڑی سوانگی ہوتی ہے' بسا اوقات شادمانی کا روپ دھار کر چلی آتی ہے۔" اور وہ آ گئی تھی۔

○

میرے لیے تو وہ کسی بھی طور مصیبت ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بے چاری مجھے خود ایک مصیبت زدہ اور پریشان حال عورت لگی تھی۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر اسی پر پڑی تھی۔ آج میں عدالت میں بہت مصروف رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین مقدمات کی سماعت نے مجھے ذہنی طور پر بری طرح تھکا دیا تھا اور دفتر بھی میں خلاف معمول خاصی تاخیر سے پہنچا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بوڑھی عورت اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس وقت انتظار گاہ میں اس کے علاوہ دو اور افراد بھی موجود تھے۔ میں ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ پہلے بھی میرے پاس آ چکے تھے۔ وہ دونوں سگے بھائی تھے اور باپ کی وفات کے بعد ان کے درمیان جائیداد کی تقسیم کیلئے ایک تنازع اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ میرے پاس قانونی مشورے کیلئے آئے تھے۔ میں نے ملاقات کیلئے انہیں آج دوپہر کا وقت دے رکھا تھا۔ سب پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

"سر! وہ بوڑھی عورت صبح سے دس چکر لگا چکی ہے۔" میں اپنی کرسی پر آکر بیٹھا ہی تھا کہ میری سیکرٹری نے کمرے میں آکر مجھے مطلع کیا۔ "اور اب گزشتہ دو گھنٹے سے دھرنا دیئے بیٹھی ہے۔ کہتی ہے' وکیل صاحب سے ملے بغیر نہیں جائے گی۔ میں نے بہت پوچھا مگر کچھ بتا کر نہیں دے رہی۔ بس ایک ہی جملہ بار بار دہرا رہی ہے کہ سب کچھ وکیل صاحب کو بتائے گی۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے' پہلے اسے ہی اندر بھیج دو۔ اور ہاں' ذرا کافی کیلئے بھی کہہ دو۔"

سیکریٹری "یس سر!" کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تو میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

دس بارہ سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ وہ بوڑھی عورت دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ میں اپنی کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میری میز کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ میں نے میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیں۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئی پھر بولی۔ "وکیل صاحب! میرے بیٹے کو بچا لیجئے وہ بے گناہ ہے۔ اسے کسی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔ میرا بیٹا قتل نہیں کر سکتا۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں' وہ ایسا نہیں ہے۔" بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کے پلو میں اپنے آنسوؤں کو جذب کیا پھر تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہمارا دنیا میں کوئی نہیں ہے وکیل صاحب! اوپر خدا ہے' نیچے آپ ہیں۔ میں بڑی امیدیں لے کر آپ کے پاس آئی ہوں اگر میرو کو کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔ میرو میرے بڑھاپے کا آخری سہارا ہے وکیل صاحب! آپ اس کی زندگی بچا لیں۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا۔ "فیس کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اللہ بخشے میرو کے ابا کو' اس کی یہ نشانی میرے پاس ہے۔" اس نے ایک پوٹلی کو کھول کر میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ میں نے دیکھا' وہ چار طلائی چوڑیاں تھیں۔ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ "میں میرو کی زندگی کیلئے اپنے مجازی خدا کی اس نشانی کو بیچ دوں گی وکیل صاحب!"

"میرو غالباً آپ کے بیٹے کا نام ہے؟" وہ ذرا خاموش ہوئی تو میں نے سوال کیا۔

"ہاں جی!" اس نے جواب دیا۔ "نام تو اس کا امیر بخش ہے لیکن خدا بخش بچپن ہی سے پیار میں بیٹے کو میرو کہتا تھا۔ پھر یہ نام مشہور ہو گیا اور امیر بخش اس کے پیچھے کہیں کھو گیا۔"

میں نے پوچھا۔ "میرو نے کس کو قتل کیا ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے' اس پر کس کو قتل کرنے کا الزام لگایا جا رہا ہے؟"

"وہ ہمارے صاحب جی تھے جی' ملک نواز علی!" اس نے بتایا۔ "ہم تو سالوں سے ان کے نمک خوار ہیں بھلا آپ ہی بتائیں' میرو اپنے مالک کو کس طرح قتل کر سکتا ہے جی؟"

ملک نواز علی کا نام سن کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے کل اخبار میں ملک نواز کے قتل کی خبر پڑھی تھی۔ یہ پرسوں صبح کا واقعہ تھا۔ خبر کے مطابق معروف صنعت کار "ملک فیبرکس" کے مالک دس جنوری کی صبح اپنی خواب گاہ میں مردہ پائے گئے تھے۔ انہیں سینے میں خنجر گھونپ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مقتول کی بیوی بلقیس جہاں نے آلہ قتل کو پہچان لیا تھا۔ وہ مذکورہ خنجر اپنی ایک دیرینہ ملازمہ رسولن کے بیٹے میرو کے پاس دیکھ چکی تھی۔ واردات کے وقت اتفاق سے' بنگلے میں ملک نواز کے سوا مالکان میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ ملک صاحب کی بیوی اپنے بیٹے کو لینے ایئرپورٹ گئی ہوئی تھی جو امریکہ سے آ رہا تھا۔ جب وہ ایئرپورٹ سے واپس گھر پہنچی تو ملک صاحب اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ بلقیس جہاں نے ہی روتے ہوئے فون پر پولیس کو اطلاع دی تھی پھر پولیس نے شام سے پہلے پہلے میرو کو ملک صاحب کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ ملک صاحب کی خواب گاہ میں موجود کپڑوں کی الماری میں سے ایک لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ بھی غائب تھے۔ بلقیس جہاں کے بہ قول' ملک صاحب نے یہ رقم واردات سے ایک روز پیشتر۔۔۔ کپڑوں کی الماری میں رکھی تھی۔ خواب گاہ کی حالت سے پتہ چلتا تھا کہ کوئی چوری ہی کی نیت سے وہاں گھسا تھا پھر شاید ملک صاحب کی آنکھ کھل گئی اور چور انہیں موت کی نیند سلا کر وہاں سے چلتا بنا۔ پولیس کیلئے یہ ایک آسان کیس تھا۔ انہوں نے بلقیس جہاں کی رپورٹ پر میرو کو ہتھکڑی پہنا کر حوالات میں بند کر دیا تھا پھر دوسرے روز اسے عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ لے لیا تھا۔ آلہ

قتل کو عدالت کی ہدایت کے مطابق فنگر پرنٹس ٹیسٹ کیلئے بھیج دیا گیا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا اور اب ملزم میرو کی بوڑھی ماں میرے سامنے بیٹھی فریاد کناں تھی کہ میں اس کے بیٹے کی زندگی بچالوں۔

پوری کتھا سننے کے بعد میں نے کہا۔ "رسولن بی بی' میں ان وکیلوں میں سے نہیں ہوں جنہیں محض اپنی فیس سے غرض ہوتی ہے اگر آپ کا بیٹا بے گناہ ہے تو میں اسے سزا سے بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ میرو اس وقت کس تھانے کے حوالات میں ہے؟"

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا پھر کہا۔ "وکیل صاحب' میں نے آپ کو پوری کہانی کی تفصیل سنا دی ہے کوئی کمی رہ گئی ہو تو آپ میرو سے پوچھ سکتے ہیں۔ آپ جو کہیں گے' میں کرنے کو تیار ہوں۔ بس آپ میرے میرو کو ظالم پولیس والوں سے بچالیں۔ انہوں نے گزشتہ رات اس بے گناہ پر بہت تشدد کیا ہے اور اسے مجبور کرتے رہے ہیں کہ وہ اپنے جرم کا اقرار کرلے مگر اس خدا کے بندے نے جیسے چپ سادھ لی ہے' خاموشی سے پٹتا رہا لیکن۔۔ ایک لفظ بول کر نہیں دیا۔ آخر وہ کب تک ان کے ظلم کو برداشت کرتا رہے گا۔"

میں نے اسے بولنے دیا۔ وہ زخمی ممتا کی آواز تھی۔ میں اہم نکات نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ جب وہ دل کی بھڑاس نکال چکی تو میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے' آپ باہر جا کر انتظار گاہ میں بیٹھیں میں اپنے دیگر موکلوں سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے ساتھ تھانے چلتا ہوں۔"

میں نے انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے موکلوں کو جلدی جلدی فارغ کیا پھر رسولن بی بی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق کچھ ضروری تیاری کی اور اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اس کے بتائے ہوئے تھانے کی جانب چل دیا۔

رسولن بی بی اور پھر بعد میں اس کیس کے دیگر کرداروں سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں ان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کرتے ہوئے میں تفصیل گوش گزار کرتا ہوں تاکہ آپ بہ آسانی اس کیس کے پس منظر کو سمجھ سکیں۔

ملک نواز علی کا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ اس کی والدہ اسے جنم دینے کے دو گھنٹے بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ وہ اپنے والدین کی واحد اولاد تھا۔ باپ

ملک غفار علی نے عمر بھر دوسری شادی نہیں کی اور حسب استطاعت نواز علی کی پرورش کرتا رہا۔ بساط بھر تعلیم بھی دلوا دی۔ چوں کہ وہ ایک سرکاری محکمے میں معمولی سا کلرک تھا اس لیے نواز علی ایسی تعلیمی ڈگریاں حاصل کرنے میں ناکام رہا جن پر عام طور پر فخر کیا جاتا ہے۔ گریجویشن کے بعد اسے ایک ٹیکسٹائل انڈسٹری میں مشین اپرنٹس کے طور پر ملازمت مل گئی۔ چند سال بعد باپ نے اس کی شادی کردی۔ شادی کے وقت نواز علی کی عمر لگ بھگ چوبیس سال تھی اور فیکٹری سے اسے معقول۔۔ تنخواہ مل رہی تھی۔ نعیمہ' نواز علی کی دور پار کی رشتے دار تھی۔ والدین کی وفات کے بعد اسے رشتے کے ایک چچا نے پالا تھا پھر میٹرک کے بعد چچا نے نعیمہ کی شادی کرکے گویا سر سے ذمے داری کا ایک بہت بڑا بوجھ اتار دیا تھا۔ نعیمہ عمر میں نواز علی سے قریب قریب آٹھ سال چھوٹی تھی۔

نواز علی کی شادی کے دو ماہ بعد ہی ملک غفار علی کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ اپنی آخری سانسوں کے دوران میں ملک غفار علی نے بیٹے کو نصیحت کی تھی "نواز بیٹا زندگی میں کامیابی کیلئے کسی ہیرا پھیری اور بے ایمانی سے کام نہیں لینا۔ میں جانتا ہوں کہ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑے جا رہا ہوں مگر تم میری مجبوریوں کو تو سمجھتے ہی ہو۔ میں۔۔" اتنا کہہ کر وہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گیا تھا۔

ملک نواز علی نے زندگی بھر باپ کی نصیحت کے برعکس عمل کیا۔ دولت جائیداد' نمود و نمائش ہمیشہ سے اس کا خواب رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس دنیا کی ہر آسائش اس کی دسترس میں ہو اور صراط مستقیم پر چلتے ہوئے اسے دور دور تک اپنی کامیابی کے امکانات نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک بدقسمتی یہ بھی تھی کہ وہ بلاشبہ ایک بدصورت شخص تھا۔ عام شکل و صورت کی لڑکی بھی اس سے دو باتیں کرنے کی روا دار نہیں تھی۔ وہ تو ملک غفار علی نے جانے کیا چکر چلایا تھا کہ نعیمہ کو بیاہ لایا تھا ورنہ نواز علی کو تو امید نہیں تھی کہ کبھی اس کی خزاں رسیدہ زندگی میں بھی بہار کا جھونکا آئے گا۔ وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر دل گرفتہ ہو جاتا تھا۔ اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش سر ابھارتی تھی کہ اس دنیا کی ہر خوب صورت لڑکی اسے حاصل ہو جائے۔ وہ چہرے مہرے کے ساتھ ساتھ اپنے قد و قامت سے بھی مار کھا گیا تھا۔ جب تک اسے باپ کے فنڈز وغیرہ نہیں مل گئے' وہ بہ امر مجبوری ملازمت کرتا رہا پھر فنڈز وصول کرتے ہی اس

نے نوکری پر لات مار دی اور محلے ہی میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ نوکری اس کے مزاج اور عزائم سے لگا نہیں کھاتی تھی۔

الغرض اپنے "ٹیلنٹ" سے استفادہ کرتے ہوئے ملک نواز علی بیس سال کی "محنت شاقہ" کے بعد شہر کے چند بڑے بڑے صنعت کاروں میں شمار ہونے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ دولت بیوی کے نصیب سے اور اولاد شوہر کے مقدر سے ملتی ہے۔ اس سلسلے میں نعیمہ کی قسمت نے زیادہ زور مارا تھا اور نواز علی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا تھا۔ شادی کے دوسرے سال ان کے یہاں ایک بیٹے نے جنم لیا تھا پھر اس کے بعد نعیمہ کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

دولت ٹوٹ کر برسی تو نواز علی کی دبی ہوئی نا آسودہ خواہشات ایک ایک کر کے سر ابھارنے لگیں۔ اب اس کے اردگرد خوب صورت تتلیوں کا ایک میلا سا لگا رہتا تھا۔ کچھ عرصے تک تو ملک صاحب کی "غیر نصابی سرگرمیاں" نعیمہ سے پوشیدہ رہیں پھر سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔ جس حد تک برداشت ہو سکتا تھا' نعیمہ بیگم نے کیا پھر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ کھاٹ سے جا لگی۔ وہ اپنے شوہر سے بے اندازہ محبت کرتی تھی۔ اس کی کج ادائی اور بے وفائی نے نعیمہ کو جیتے جی سپرد موت کر دیا تھا۔ وہ دس سال بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا رہ کر چل بسی تھی۔ نعیمہ کی موت کے ایک سال بعد ہی نواز علی نے اپنی حسین و جمیل سیکریٹری بلقیس جہاں سے شادی رچا لی تھی۔ اب اس شادی کو بھی تقریباً ایک سال گزر چکا تھا۔ نواز علی ایسے آہوے آوارہ سے ایسی "حرکت" کی کسی کو امید نہ تھی۔ کافی عرصے تک اس کے قریبی حلقوں میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں پھر سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔ سمجھ دار لوگوں کا متفقہ خیال یہ تھا کہ بلقیس جہاں نے ملک صاحب کو الو کا گوشت کھلا دیا تھا۔ انچاس سالہ ملک نواز علی نے بائیس سالہ بلقیس جہاں سے بیاہ رچا کر خود کو سوالیہ نشان بنا لیا تھا۔

ملک صاحب کا اکلوتا بیٹا برکت امریکہ میں ایم بی اے کر رہا تھا۔ نواز علی خود تو اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا اس لیے وہ اپنی محرومی کا ازالہ بیٹے کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دلوا کر کرنا چاہتا تھا۔ برکت' نواز علی کے لیے ناپسندیدگی کا جذبہ رکھتا تھا۔ جس کی بڑی وجہ نواز علی کا برکت کی ماں نعیمہ سے نامناسب رویہ تھا۔ برکت نے ہمیشہ ماں کی حمایت کی

تھی۔ پھر نعیمہ کی وفات کے بعد تو وہ باپ کی طرف سے بالکل ہی بددل ہو گیا تھا چنانچہ جب بلقیس جہاں اس گھر کی نئی مالکہ کے روپ میں نیاز علی کی بیوی بنی تو برکت کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی اس کی ماں کی جگہ لے اور ایسی صورت میں کہ اس کی ماں نعیمہ نے بڑی کسمپرسی کی حالت میں جان دے دی تھی۔ برکت نے گزشتہ ایک سال سے پلٹ کر پاکستان کا رخ نہیں کیا تھا حالانکہ وہ اگر چاہتا تو سال میں چار چکر بہ آسانی لگا سکتا تھا۔ وہ ایک طرف اپنے باپ سے برگشتہ تھا تو دوسری جانب اپنی سوتیلی ماں کی صورت دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ والد کے بے حد اصرار اور منت سماجت کے بعد وہ چند روز کیلئے کراچی آیا تھا مگر ملک نواز اس کی آمد سے پیشتر ہی دوسری دنیا کو سدھار گیا تھا۔

رسولن بی بی کو ملک نواز علی کی چاکری میں کم و بیش پندرہ سال ہو گئے تھے۔ وہ جب اس گھر میں آئی تھی تو میرو پانچ سال کا تھا۔ رسولن بی بی' نعیمہ کی دور کی رشتے دار بھی تھی جو خاصی ضربوں تقسیموں کے بعد اس کی خالہ زاد لگتی تھی۔ ملک نواز نے رسولن کو بنگلے ہی میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ بنگلے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے ایک سرونٹ کوارٹر میں دونوں ماں بیٹا رہتے تھے۔ نعیمہ اپنی بیماری کے سبب برکت پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتی تھی چنانچہ برکت کا خیال رکھنے کی زیادہ تر ذمے داری رسولن ہی کو نبھانا پڑتی تھی۔ برکت بھی جواب میں رسولن کا بہت احترام کرتا تھا اور اس نے رسولن کو کبھی ملازمہ نہیں سمجھا تھا۔ وہ گھر کے ایک فرد ہی کی طرح اس کا خیال رکھتا تھا۔ البتہ میرو کو وہ پسند نہیں کرتا تھا۔ میرو سے گھر کے ہر فرد کو شکایت تھی۔ اس کی عادتیں ہی کچھ ایسی ہو گئی تھیں۔ وہ اکثر راتوں کو گھر سے باہر رہنے لگا تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں میں نہیں تھا۔ دو ایک بار تو وہ چوری کرتے ہوئے بھی پکڑا گیا تھا۔ ایک مرتبہ نوبت تھانے تک جا پہنچی تھی۔ ان دنوں نعیمہ زندہ تھی۔ اسی کے اصرار پر ملک نواز' علی میرو کو تھانے سے چھڑا لایا تھا۔

نعیمہ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے نواز علی کا رویہ میرو کے سلسلہ میں بڑا جارحانہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا مگر برکت کی حمایت اور رسولن کے بڑھاپے کا خیال کر کے وہ درگزر کر جاتا۔ اگرچہ برکت بھی میرو کی حرکتوں سے عاجز تھا مگر رسولن کی

خدمات کے طفیل وہ اسے الاؤنس دیتا رہتا تھا۔ برکت کے امریکہ چلے جانے کے بعد تو میرو کی جیسے شامت ہی آ گئی تھی۔ اب وہ راتوں کو چھپ چھپا کر ہی گھر آتا۔ بنگلے میں داخل ہونے کیلئے وہ ہمیشہ عقبی دروازہ استعمال کرتا تھا جو رسولن کے کوارٹر کے نزدیک ہی تھا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا کہ بلقیس جہاں کی آمد نے بنگلے کی پرسکون فضا میں ایک ہلچل سی مچا دی۔

وہ حسن جہاں سوز کی مالک ایک طرح دار حسینہ تھی۔ لمبی سیاہ زلفیں' یاقوتی ہونٹ اور آنکھوں میں جیسے کوٹ کوٹ کر موتی بھرے تھے۔ اگر ملک صاحب کی پہلی اولاد برکت کے بجائے کوئی لڑکی ہوتی تو بلقیس جہاں' ملک نواز کی اس بیٹی کے برابر ہی ہوتی پھر دیکھنے میں ملک صاحب کسی بھی طور بلقیس جہاں کے قابل نظر نہیں آتے تھے۔ دولت کی چکا چوند نے شاید بلقیس جہاں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی کہ وہ اندھیرے اور اجالے کی تمیز بھی کھو بیٹھی تھی۔ بہرحال حقیقت یہی تھی کہ بلقیس جہاں نے کسی دباؤ میں آئے بغیر اپنی مرضی سے یہ شادی کی تھی۔

بلقیس جہاں کیا بنگلے میں آئی کہ میرو کے دل کی دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ وہ آوارہ گرد' چور اور لاابالی سا نوجوان اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ وہ بلقیس جہاں کو دیکھ کر جی جی اٹھتا تھا مگر اس کی یہ وارفتگی یک طرفہ تھی۔ بلقیس جہاں کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ کوئی اس کے نام کی مالا جپ رہا تھا۔ چند ماہ تک تو میرو نے اپنے سینے میں موجزن طوفان کی راہ میں بند باندھے رکھا پھر اس کی حرکات و سکنات اس کی دلی کیفیات کی چغلی کھانے لگیں۔ بات ملک صاحب کے کانوں تک پہنچی تو بنگلے میں جیسے کوئی زلزلہ برپا ہو گیا۔

پھر کیا تھا نواز علی جس حد تک بھی میرو کو ذلیل کر سکتا تھا' اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ میرو کی ماں کو بھی بے حد شرمندگی اٹھانا پڑی تھی۔ میرو کے' بنگلے میں داخلے پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ رسولن بی بی کو ایک ہفتے کے اندر اندر بنگلا چھوڑ دینے کا حکم سنا دیا گیا تھا۔ وہ بے کس' بے چاری بڑھیا آنسو بہانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔ نعیمہ اب اس دنیا میں تھی نہیں جو وہ اس سے فریاد کرتی اور برکت بھی یہاں سے دور دیار غیر میں بیٹھا تھا۔ رسولن کی اس تک رسائی ممکن نہ تھی۔ وہ بچپن میں ملک

برکت علی کو برکت بابا کہہ کر پکارتی رہی تھی۔ شاید یہ اس کی محبت کا ہی اثر تھا کہ وہ بعد میں برکت بابا کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس گھر کا وارث جس گود کی نرمی و گرمی میں پل کر بڑا ہوا تھا' اس گود کی مالکہ کو چھت سے محروم کیا جا رہا تھا۔ شاید یہ اس کی ان تھک خدمات کا صلہ تھا اگر واقعی ایسا تھا تو رسولن بی بی کے ساتھ بہت برا ہوا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس سے کہیں زیادہ بھیانک تھا۔

میرو کے بنگلے سے بے دخل کئے جانے کے دو روز بعد ملک نواز علی اپنی خواب گاہ میں مردہ پایا گیا تھا۔

○

تھانے کے سامنے پہنچ کر میں نے اپنی گاڑی ایک جانب تھانے کی بیرونی دیوار کے ساتھ پارک کر دی۔ رسولن بی بی کو میں نے گاڑی ہی میں بیٹھے رہنے کی تاکید کی پھر اپنا بریف کیس اٹھا کر گاڑی سے باہر آ گیا۔ جنوری کے مہینے میں شام جلدی ہو جاتی ہے۔ اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ سورج غروب ہونے میں بہت کم وقت باقی رہ گیا تھا۔

میں تھانے کے اندر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایس ایچ او صاحب تشریف نہیں رکھتے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی اطلاع نہیں تھی۔ اکثر تھانوں میں تھانہ انچارج صاحبان عام طور پر شام کے بعد ہی ”تشریف“ لاتے ہیں۔ میں سیدھا ہیڈ محرر کے پاس چلا گیا۔ اسے تھانے میں اپنی آمد کی وجہ بتائی تو وہ ایک مخصوص انداز میں بولا۔ ”ایس ایچ او صاحب تو ابھی آئے نہیں ہیں۔ آپ ان کا انتظار کر لیں۔“

”میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔“ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرو کی ماں نے مجھے اس کا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں میرو سے وکالت نامہ سائن کروانے آیا ہوں۔ اس معمولی سے کام کیلئے ایس ایچ او صاحب کی کیا ضرورت ہے؟“

”میرو قتل کا ملزم ہے جناب وکیل صاحب!“ اس نے مجھے قانون پڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اس کا ریمانڈ لے رکھا ہے ابھی ہماری تفتیش مکمل نہیں ہوئی' آپ اس سے عدالت کے کمرے میں ملاقات کر لیجئے گا جناب۔“

"وہاں بھی مل لوں گا۔" میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو یہاں پر ملنا ضروری ہے۔"

خیر تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد ہیڈ محرر نے ایک کانسٹیبل کی موجودگی میں مجھے میرو سے مختصر ملاقات کی اجازت دے دی۔ پولیس والوں کو اپنے دام میں لانے کیلئے بعض اوقات عجیب و غریب ہتھکنڈے بھی آزمانا پڑتے ہیں جن پر اگر علیحدہ سے ایک کتاب مرتب کی جائے تو بلاشبہ یہ ایک دلچسپ اور حیرت انگیز کتاب ثابت ہو سکتی ہے۔ بہرحال میں اس صورتحال کا عادی ہو چکا تھا۔ چنانچہ یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہوتی تھی۔

میرو حوالات میں سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے بریف کیس میں سے وکالت نامہ نکالا پھر ایک بال پین میرو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہاں پر دستخط کر دو۔" میں نے وکالت نامہ پر ایک مخصوص جگہ پر انگلی رکھی۔ میرو ایک لمحے کیلئے ہچکچایا' میں نے اس کی ہچکچاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ماں نے مجھے جو کچھ بتایا ہے اس کی روشنی میں' میں نے تمہاری وکالت کی حامی تو بھر لی ہے لیکن ۔۔"

میں نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگا۔ وہ بیس اکیس سال کا ایک گبرو جوان تھا۔ انتہائی خوبصورت نہ سہی لیکن وہ قبول صورت نوجوان ضرور تھا۔ وہ یقینی طور پر ایک صحت مند شخص تھا مگر پولیس کی۔ "مہمان نوازی" نے اس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں ویرانی جھانک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں بھی اس خوف کی جھلک بڑی واضح محسوس ہو رہی تھی۔

"لیکن کیا وکیل صاحب!" وہ دستخط کر چکا تو بولا۔ میں نے دیکھا' اس نے دستخط کے نام پر اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے بال پین سے چند کیڑے مکوڑے بنا دیئے تھے جس سے صاف ظاہر تھا کہ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں وہ کورا ہی تھا۔

میں نے کہا۔ "میں تمہاری زبان سے سچ سننا چاہتا ہوں۔" حالانکہ رسولن کی بپتا سن کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرو بے گناہ تھا اور واقعی اسے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پھانسا گیا تھا۔ اگر مجھے کہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوتا تو میں میرو کی وکالت کیلئے

اپنی رضا مندی کا اظہار ہرگز نہیں کرتا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ قتل میرو نے نہیں کیا ہو گا مگر عدالت دل کی گواہی کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہاں تو ٹھوس دلائل سے اپنی بات کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے میں میرو کو مزید ٹٹولنا چاہتا تھا تاکہ مجھے کچھ ایسے اشارے مل سکیں جن کی مدد سے میں اس کیس کو بہتر طور پر آگے بڑھا سکوں۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "جس رات ملک نواز علی کو قتل کیا گیا' تم کہاں تھے؟"

"میں نے ملک صاحب کو قتل نہیں کیا جناب!" وہ اٹک اٹک کر بولا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں' تم اس وقت کہاں تھے؟ میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے۔" وہ تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ "اگر تم خود کو پھانسی کے پھندے سے بچانا چاہتے ہو تو مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہاری ماں نے بتایا ہے کہ تم نے پولیس کو بھی نہیں بتایا کہ ملک صاحب کے قتل کے وقت تم کہاں تھے؟ جائے واردات سے تمہاری غیر موجودگی ظاہر ہونا ضروری ہے۔ مجھے یہ بات ثابت کرنا ہو گی ورنہ تم تو سیدھے سیدھے پھنسے ہوئے ہو۔ تمہاری ماں بھی اس بات کی تصدیق کر چکی ہے کہ جس خنجر سے ملک صاحب کو قتل کیا گیا ہے وہ تمہاری ملکیت تھا۔ حالات و واقعات بھی تمہاری ہی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ دو روز پیشتر تمہارا ملک صاحب سے شدید ترین جھگڑا بھی ہو چکا تھا۔ تمہارا یہ جھگڑا ملک صاحب کو قتل کرنے کا ایک معقول جواز سمجھا جا سکتا ہے بلکہ مقتول کی بیوہ نے یقین ظاہر کیا ہے کہ تم ہی اس کے شوہر کے قاتل ہو۔ اب پولیس کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہاری موجودگی میں کسی اور قاتل کو تلاش کرتی پھرے۔ اگر تم نے زبان نہیں کھولی اور مجھے حقائق سے آگاہ نہیں کیا تو میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ تھوک نگل کر بولا۔ "جب ملک صاحب نے بنگلے میں' میرے داخلے پر پابندی لگا دی تو میں اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔"

"تمہارا دوست کہاں رہتا ہے اور اس کا نام کیا ہے؟"

"وہ منظور کالونی میں رہتا ہے۔" میرو نے بتایا۔ "اس کا نام مظفر علی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا مظفر علی اس بات کی گواہی دینے کیلئے تیار ہو جائے گا کہ واردات کے وقت تم اس کے گھر میں تھے؟"

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بات بتانا تو چاہتا ہے لیکن پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیتا ہے۔ میں نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "مظفر علی کے گھر میں اور کون کون رہتا ہے۔ میرا مطلب ہے اس کی بیوی' بچے وغیرہ۔"

"اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی' ایک کوارٹر میں اکیلا رہتا ہے۔"

ملک نواز علی کا بنگلا پی ای سی ایچ ایس میں تھا۔ منظور کالونی وہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے سوال کیا۔ "واردات والی رات تم مظفر علی کے گھر میں ہی رہے تھے یا اس کے ساتھ کسی وقت باہر بھی گئے تھے؟" میرے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ میرو چوری کے کیس میں ایک دو بار تھانے بھی جا چکا تھا۔ یہ بات مجھے رسولن ہی کی زبانی پتہ چلی تھی۔ مظفر علی کے تذکرے نے میرے ذہن میں ایک شک پیدا کر دیا تھا۔ میں اس شک کو دور کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تمہارا دوست مظفر علی کام کیا کرتا ہے؟"

میرو کا رنگ فق ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میرو نے پریشان لہجے میں بتایا۔ "وہ کوئی مستقل کام تو نہیں کرتا جی۔ جو بھی کام مل جائے کر لیتا ہے۔"

"اس رات تم دونوں ایک ساتھ "کام" پر گئے تھے نا؟" میں نے اس کی مدد کی۔ "اور تم اس کی باتوں میں آگئے پر تم دونوں مل کر۔۔"

میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے میرو کی جانب دیکھا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ وہ بولا۔ "میں نے اسی دن چوری سے توبہ کر لی تھی وکیل صاحب! جب ملک صاحب مجھے تھانے سے چھڑا کر لائے تھے مگر مظفر علی کے روپ میں شیطان نے مجھے بہکا دیا تھا اور میں اس کے ساتھ چلا گیا۔"

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں نے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "مظفر علی منظور کالونی میں کس جگہ رہتا ہے؟" میرو نے تفصیل سے مظفر علی کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ میں نے وہ پتہ اپنی ڈائری میں نوٹ کرنے کے بعد کہا۔ "مظفر علی تمہاری' اپنی گھر میں

وجودگی کی گواہی دینے کو تیار ہو گیا تو یہ عدالت میں تمہارے حق میں ایک اہم نکتہ ہو گا۔ س سے مجھے تمہارا مقدمہ لڑنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔"

میرو کے چہرے پر پہلی بار میں نے اطمینان کی جھلک دیکھی۔ وہ بولا۔ "وکیل ماحب' میں رہا ہو جاؤں گا نا؟"

"میں صرف کوشش کرنے کا وعدہ کر سکتا ہوں۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ہر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی' تمہارا خنجر کس طرح اتل تک پہنچ گیا تھا؟" یہ جاننا بہت ضروری تھا کیوں کہ یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ ملک از کو جس خنجر سے قتل کیا گیا تھا وہ میرو کی ملکیت تھا اور یہ بات سراسر میرو کی مخالفت ں جاتی تھی۔ "تمہیں یاد ہے کہ تم نے وہ خنجر کس کو دیا تھا؟"

"میں نے وہ خنجر کسی کو نہیں دیا تھا جناب!" وہ پرخیال لہجے میں بولا۔ "مجھے اچھی رح یاد ہے۔ ہاں' دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔ ماں نے میرے پاس خنجر دیکھ لیا تھا۔ میں پڑے تبدیل کر رہا تھا کہ اس کی خنجر پر نظر پڑ گئی۔ اس نے مجھے بہت برا بھلا کہا۔ وہ مجھے رزنش کر ہی رہی تھی کہ اچانک چھوٹی بی بی نے اسے آواز دے کر بلا لیا۔ (چھوٹی بی بی ے میرو کی مراد بلقیس جہاں تھی۔ ملک نواز علی کی پہلی بیوی نعیمہ کو دونوں ماں بیٹے بڑی بی جی کے نام سے یاد کرتے تھے) خنجر اس وقت ماں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جلدی میں خنجر بھی اپنے ساتھ ہی لے کر گئی تھی۔ جب وہ خاصی دیر تک واپس کوارٹر میں نہیں آئی تو ں تیار ہو کر باہر چلا گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ رات کو ماں سے اس بارے میں بات کروں مگر رات کو میں نے جب ماں سے خنجر کا تذکرہ کیا تو اس نے بتایا کہ اس نے وہ خنجر وٹی بی بی جی کو دے دیا ہے اور چھوٹی بی بی جی نے کہا ہے کہ وہ اس خطرناک چیز کو خود یں پھینک دے گی۔ میں ماں کی بات سن کر خاموش ہو رہا۔ چھوٹی بی بی جی سے اس ے میں بات کرنے کی مجھے ہمت نہیں ہوئی۔" اس کے چہرے پر اچانک ایک رنگ سا گیا۔ اس رنگ میں ایک عجیب سا جوش محسوس کیا تھا میں نے۔ شاید وہ کوئی چور جذبہ جو ایک چور کے چہرے پر نمودار ہو گیا تھا۔

جب مجھے پتہ چلا تھا کہ میرو نے پولیس والوں کو یہ بتانے سے انکار کر دیا ہے کہ وہ دات والی رات کہاں تھا تو میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ یقینی طور پر وہ کسی

ایسی جگہ مصروف رہا ہو گا جس کا وہ اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتا ہو گا پھر اس کے سابق
"شوق" کے بارے میں جاننے کے بعد میرا ذہن چوری ہی کی طرف گیا تھا اور اب میرو کی
زبانی اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ مظفر علی کو گواہی کیلئے تیار کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔
دوسری اہم بات میں میرو سے خنجر کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں
میرو نے جو کہانی سنائی تھی وہ اس کی ماں کے بیان سے مطابقت رکھتی تھی۔ اب کوئی
خاص بات باقی نہیں رہ گئی تھی جو میرو سے پوچھی جاتی اس لیے چند رسمی سے سوالات کر
کے میں وہاں سے چلا آیا۔ میں جب واپس جا رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ ایس ایچ او
صاحب آ گئے ہیں۔ جاتے جاتے میں نے ان سے ملنا بھی ضروری سمجھا۔ اس طرح مجھے
ایف آئی آر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ درحقیقت میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ ملزم پر
کون کون سی دفعات لگائی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ کام خاصا مشکل تھا لیکن بہرحال میں نے کسی
نہ کسی طور کر ہی ڈالا۔ پولیس نے ملزم امیر بخش عرف میرو کو دفعات تین سو دو اور تین سو
اسی پی پی سی (پاکستان پینل کوڈ) کے تحت گرفتار کر کے عدالت سے سات روز کا ریمانڈ
حاصل کر لیا تھا۔ دفعہ تین سو دو تو ملک نواز کے قتل کے الزام لگائی گئی تھی جب کہ دفعہ
تین سو اسی کے تحت میرو پر الزام میں لگایا گیا تھا کہ اس نے مقتول کے گھر سے ایک لاکھ
روپے کے کرنسی نوٹ بھی چوری کئے تھے۔

میں تھانے سے نکل کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیلنا شروع
ہو چکا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی تو رسولن بی بی نے بے چینی سے استفسار کیا۔ "وکیل
صاحب میرا میرو چھوٹ جائے گا نا؟" اس کی بوڑھی آنکھوں میں امید کے دیئے ٹمٹما رہے
تھے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گاڑی کو ڈرائیو کرتے ہوئے مین روڈ
لے آیا۔ میں پچھلی سیٹ کا منظر دکھانے والے آئینے میں رسولن بی بی کے اضطراب کا
جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "وکیل صاحب! میرے
دل میں تو جیسے پنکھے سے لگ گئے ہیں میں اندر ہی اندر بری طرح تڑپ رہی ہوں۔ اگر
آپ نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تو میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

"اللہ پر بھروسا رکھیں۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو عدالت
سے انصاف دلانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

پھر میں نے رسولن بی بی کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور اسے ملک نواز علی کے
بنگلے کے نزدیک ڈراپ کرنے کے بعد اپنے گھر کی راہ لی۔ مجھے اس کیس کی تیاری کیلئے
ابھی بہت سے ضروری کام کرنا تھے پھر پورے کیس کا باریک بینی سے مطالعہ بھی کرنا تھا۔
میں جانتا تھا کہ آئندہ دو تین روز مجھے بہت مصروف رہنا تھا۔

○

پولیس نے پانچویں روز عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ پولیس کیلئے یہ ایک "روکھا
پھیکا" کیس تھا۔ میرو کے بجائے اگر کوئی موٹی مرغی ان کے ہتھے چڑھی ہوتی تو مزید سات
روز کا ریمانڈ بھی لیا جا سکتا تھا۔ ریمانڈ کا دورانیہ پولیس کیلئے کسی سنہری دور سے کم نہیں
ہوتا اور اگر "اسامی" کوئی مال دار قسم کی ہو تو ان کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ ظاہر
ہے' ملزم کے صاحب حیثیت لواحقین اسے پولیس کی "تفتیش" سے بچانے کیلئے اپنی
جانب سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

میرو نے میری ہدایات کے مطابق اقبال جرم کر لیا تھا۔ میں نے اسے تاکید کی تھی
کہ اگر پولیس کی مزید "مہمان نوازی" سے لطف اندوز ہونے کا موڈ نہیں ہے تو بھلائی
اسی میں ہے کہ اس کے حسب منشا بیان دیا جائے۔ بہ صورت دیگر وہ یہی کام اپنے مقبول
عام مروجہ ہتھکنڈوں سے کرا لینے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ میری بات میرو کی سمجھ
میں آ گئی تھی اور وہ مزید مار پیٹ سے محفوظ رہا تھا۔ پولیس کی کسٹڈی میں کئے گئے اقبال
جرم کو میں عدالت کے کمرے میں ملزم کے منہ سے نکلے ہوئے ایک جملے سے باطل ثابت
کر سکتا تھا۔ پولیس نے اپنے چالان میں قتل کا محرک محبت اور رقابت کو قرار دیا تھا۔ میرو
کی داستان عشق اب دل کی عدالت سے دنیا کی عدالت تک دراز ہو چکی تھی۔

میں نے اپنا وکالت نامہ مع میرو کی درخواست ضمانت عدالت میں داخل کر دیا تھا۔
استغاثہ کی جانب سے کوئی عینی شاہد عدالت میں پیش نہیں ہوا تھا البتہ مقتول کی بیوہ بلقیس
جہاں' مقتول کا بیٹا برکت اور چوکیدار بندوق خان بطور گواہ وہاں موجود تھے۔ ایک اور
شخص تصدق حسین کا نام بھی گواہوں کی فہرست میں شامل تھا۔ تصدق حسین' ملک نواز
علی کی رہائش گاہ کے عقب میں واقع ایک بنگلے کا چوکیدار تھا۔ میں پولیس کو دیئے ہوئے

گواہوں کے بیانات کی نقول حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پولیس کے تیار کردہ مشیر نامے کی ایک کاپی میں پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی آگاہ ہو چکا تھا۔ اس رپورٹ کے مطابق ملک نواز کی موت دس جنوری کی صبح چار سے پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ فنگر پرنٹس کی رپورٹ میرو کے حق میں جاتی تھی۔ خنجر کے دستے پر پائے جانے والے نشانات میرو کی انگلیوں کے نشانات سے قطعی مختلف تھے۔

عدالت نے میرو کی درخواست ضمانت مسترد کر دی۔ مقدمے کی ابتدائی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت نے باقاعدہ سماعت کیلئے تاریخ دے دی۔ میرو کو جوڈیشل کسٹڈی کے تحت جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اپنے اقبالی بیان کی ساری ذمے داری اس نے پولیس پر ڈال دی تھی۔

میں عدالت سے باہر آیا تو میرو کی ماں میرے ساتھ ساتھ تھی۔ ”وکیل صاحب' میرو کو تو سزا ہو گئی اسے جیل بھیج دیا گیا ہے۔“ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ ”آپ تو کہہ رہے تھے' وہ رہا ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”میرو کو عدالت نے سزا نہیں سنائی ہے۔ ابھی تو مقدمہ شروع ہوا ہے۔ انشاء اللہ میں ایک دو پیشیوں میں اس کی ضمانت کروانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

رسولن بی بی اس دوران میں ملک نواز علی کے بنگلے کو خیرباد کہہ چکی تھی اور اپنے ایک رشتے دار کے یہاں اٹھ آئی تھی۔ برکت نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس نے اس کی کوئی بات نہیں مانی تھی۔ اس روز دوسری عدالتوں میں بھی میرے چند مقدمات زیر سماعت تھے۔ رسولن بی بی کو رخصت کرنے کے بعد میں ایک دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔ آج کا دن مجھے بہت مصروف رہنا تھا۔ پھر رات گھر جا کر بھی میرو کی فائل کا مطالعہ کرنا تھا۔ میں پیشی سے پہلے اچھی طرح تیاری کر لینا چاہتا تھا۔ یہ میرا ہمیشہ سے معمول رہا تھا۔

○

اس روز عدالت میں خاصا رش تھا۔ میں نے حاضری لگانے کے بعد پیش کار سے

اپنے مقدمے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ آج پہلا کیس ہمارا ہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد پولیس کی گاڑی میں میرو کو عدالت میں لایا گیا۔ تفتیشی افسر ایک اے ایس آئی تھا۔ اس کے ساتھ دو کانسٹیبل بھی تھے۔ میرو کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ جج صاحب کی آمد کے بعد مقدمے کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔

سب سے پہلے استغاثہ کے گواہوں میں سے مقتول کا چوکیدار بندوق خان گواہوں کے کٹہرے میں لایا گیا۔ حلف اٹھانے کے بعد اس نے بیان دیا کہ دس جنوری کی صبح وہ حسب معمول نماز فجر سے فارغ ہو کر بیرونی گیٹ پر ڈیوٹی دے رہا تھا کچھ ہی دیر کے بعد بلقیس جہاں نے اسے گیٹ کھولنے کیلئے کہا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ بلقیس جہاں کے جانے کے بعد اس نے گیٹ بند کر دیا۔ وہ بلقیس جہاں کو اتنی صبح گاڑی میں کہیں جاتے ہوئے دیکھ کر حیران تو ہوا تھا مگر اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے خیال میں تو ملک صاحب کو جانا چاہئے تھا۔ رات کو ملک نواز نے اس سے کہا تھا کہ وہ صبح برکت کو لینے ایئرپورٹ جائے گا اور یہ ہدایت بھی کی تھی کہ اس بات کا ذکر وہ کسی اور سے نہ کرے۔ ملک صاحب کا ڈرائیور اپنی شادی کے سلسلے میں ایک ماہ کیلئے مردان گیا ہوا تھا۔ اس دوران میں ملک صاحب نے جب علی الصباح ایئرپورٹ جانے کا تذکرہ کیا تھا تو بندوق خان نے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ اجازت دیں تو بندوق خان خود جا کر اپنے چھوٹے مالک کو ایئرپورٹ سے لے آئے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ملک صاحب کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ اور اتنی سردی میں ان کا گھر سے نکلنا ان کی صحت کیلئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا تھا مگر ملک صاحب نے یہ کہہ کر اس کی بات رد کر دی تھی کہ وہ ہرحال میں خود جانا چاہتے ہیں۔ بندوق خان اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ملک نواز علی کی موت کے بارے میں اسی وقت پتہ چلا تھا جب بلقیس جہاں برکت کے ساتھ واپس آئی تھی اور اس نے ملک صاحب کے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی چیخ پکار شروع کر دی تھی۔

بندوق خان کا بیان ختم ہوا تو جج نے میری جانب دیکھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں چاہوں تو جرح شروع کر سکتا ہوں۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”بندوق خان! آپ نے اپنے حلفیہ بیان میں ابھی عدالت کو بتایا کہ وقوعہ کی رات مقتول نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ علی الصباح اپنے

بیٹے کو لینے کیلئے ایئرپورٹ جانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے کتنے بجے جانے کو کہا تھا؟"

"انہوں نے وقت نہیں بتایا تھا' بس یہ کہا تھا کہ اذان کے بعد جائیں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "آج کل فجر کی اذان کم و بیش چھ بجے ہوتی ہے۔ عام طور پر اذان کے بیس پچیس منٹ بعد نماز ادا کی جاتی ہے آپ یہ بتائیں کہ آپ نے اذان کے فوراً بعد نماز پڑھ لی تھی یا کچھ وقفے کے بعد پڑھی تھی؟"

"ہم جب نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو اس وقت ہمارا گھڑی میں چھ بج کر بیس منٹ ہوا تھا۔"

"آپ نے بتایا ہے کہ مقتول نے اذان کے بعد ایئرپورٹ جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن جب وہ اذان کے بعد روانہ نہیں ہوا تو آپ کو تشویش نہیں ہوئی؟"

"ہوا تھا جناب ہم کو تشویش ہوا تھا مگر ہم نے سوچا' شاید دیر سے جائے گا۔ ہمارا صاحب کا طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھا اسی لیے اس روز ہم مسجد بھی نہیں گیا بلکہ اپنے کیبن میں ہی ہم نے نماز ادا کیا تھا۔"

وکیل استغاثہ اطمینان سے میری کارروائی کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابھی تک اس نے میرے کسی سوال پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں نے بندوق خان سے پوچھا۔ "بندوق خان! جب مقتول کے بجائے اس کی بیوی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو رہی تھی تو آپ کو کچھ عجیب محسوس نہیں ہوا تھا؟ آپ بتا چکے ہیں کہ مقتول نے خود ایئرپورٹ جانے کے بارے میں رات ہی آپ کو آگاہ کر دیا تھا۔"

"ہم کو حیرت تو بہت ہوا تھا وکیل صاحب مگر ہم نے سوچا' صاحب کا طبیعت زیادہ خراب ہو گیا ہو گا جو بیگم صاحبہ خود جا رہا تھا۔"

"بندوق خان!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ نے اپنی بیگم صاحبہ سے یہ پوچھنے کی کوشش کی تھی کہ ملک صاحب خود کیوں نہیں جا رہے ہیں؟"

وہ ایک لمحے کیلئے گڑبڑا گیا پھر جلدی سے بولا۔ "نہیں جناب ہم نے بیگم صاحبہ سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔"

"بندوق خان! آپ نے پولیس کو جو بیان دیا تھا اس میں یہ بات درج ہے کہ جب آپ نے مقتول کے بجائے اس کی بیوی کو گاڑی نکالتے ہوئے دیکھا تو اس سے اس بارے میں پوچھا تھا۔ بلقیس جہاں نے آپ کو جواب دیا تھا کہ ملک صاحب رات بھر شدید تکلیف میں مبتلا رہے تھے چنانچہ اس نے انہیں آرام کرنے کی تاکید کی تھی اور خود برکت کو لینے ایئرپورٹ جا رہی تھی۔ بندوق خان! آپ کے کون سے بیان کو درست سمجھا جائے؟"

وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ اس نے پریشان نظروں سے بلقیس جہاں کی جانب دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ہم نے پولیس کو ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔"

"جناب عالی!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پولیس نے گواہوں کے جو بیان عدالت میں پیش کئے ہیں' ان میں بندوق خان کے بیان میں وہ بات موجود ہے جس کیلئے گواہ انکار کر رہا ہے۔ بیان کے نیچے گواہ کا نشان انگوٹھا بھی موجود ہے۔"

جج نے بندوق خان سے کہا۔ "وکیل صفائی کے سوال کا جواب دیا جائے۔"

بندوق خان نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "ہم کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے جناب! پولیس نے ہم سے جو پوچھا' ہم نے بتایا۔ ہم نے ایسا کوئی بات نہیں کہا تھا۔ پولیس نے اپنی طرف سے خود ہی لکھ لیا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے بندوق خان!" میں نے اپنے انداز میں ذرا سی تبدیلی کرتے ہوئے سوال کیا۔ "بلقیس جہاں کی گاڑی کتنے بجے بنگلے سے روانہ ہوئی تھی؟"

"ہمارے کیبن میں دیوار کا گھڑی لگا ہوا ہے۔" بندوق خان نے بتایا۔ "بیگم صاحبہ کے جانے کے بعد ہم گیٹ بند کر کے اپنے کیبن میں آ گیا تھا۔ اسی وقت ہمارا نظر گھڑی پر پڑا تھا۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا۔" جج نے اپنے کاغذات میں کچھ نوٹ کیا۔ میں نے بندوق خان سے سوال کیا۔

"بیگم صاحبہ کی واپسی کب ہوئی تھی؟"

"دوپہر سے کافی دیر پہلے۔" بندوق خان نے بتایا۔ "ہم نے وقت نہیں دیکھا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

بندوق خان کے بعد تصدق حسین گواہوں کے کٹہرے میں آیا۔ اس نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ نو جنوری کی رات اس کے مالک کے بیٹے کی سالگرہ تھی اس لئے ان کی کوٹھی میں رات گئے تک خوب ہنگامہ رہا تھا۔ تصدق حسین مذکورہ کوٹھی میں چوکیدار تھا اور یہ کوٹھی ملک نواز علی کے بنگلے کے عقب میں واقع تھی۔ ملک نواز کے بنگلے کا عقبی دروازہ کوٹھی کی جانب ہی کھلتا تھا۔ تصدق حسین نے بتایا۔ "میں رات تقریباً دو بجے فارغ ہوا تھا۔ مہمان ایک ایک کر کے جا رہے تھے اور مجھے بار بار ان کیلئے گیٹ کھولنا پڑتا تھا۔ جب آخری مہمان جا چکا تو میں نے سکون کی سانس لی۔ اس وقت دو بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے گیٹ کو اندر سے لاک کیا اور سونے کیلئے اپنے کوارٹر میں چلا آیا۔ ابھی مجھے سوئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اپنے پیٹ میں گڑبڑ کا احساس ہوا تو میں فوراً باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ شاید رات کو زیادہ کھا لینے کی وجہ سے میرا پیٹ خراب ہو گیا تھا۔ باتھ روم میں اچھا خاصا وقت گزارنے کے بعد میں فارغ ہوا تو سوچا، چلو جاگ تو گیا ہوں کیوں نہ ایک چکر کوٹھی کے سامنے کے حصے کا بھی لگا لوں۔ میں نے اچھی طرح گھوم پھر کر تسلی کر لی۔ بیرونی گیٹ کے تالے کو چیک کرنے کے بعد میں اپنے کوارٹر کی جانب جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے ملک صاحب کے پچھواڑے ایک شخص کو مشکوک انداز میں گزرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سردی سے بچنے کیلئے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ میں نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا اور اپنے کوارٹر میں جا کر سو رہا۔ دوسرے روز ملک صاحب کے قتل کا چرچا ہوا تو مجھے وہ پراسرار شخص یاد آ گیا۔ پھر پولیس کے پوچھنے پر میں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔"

تصدق حسین نے پولیس کو جو بیان دیا تھا کم و بیش ویسا ہی بیان اس نے آج بھی دیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے گی۔ میں خواہ مخواہ جرح کر کے عدالت کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری جانب سے جب کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تو جج نے اگلے گواہ کو پیش کرنے کا حکم دیا۔

اگلا نمبر برکت کا تھا۔ وہ بے چارہ یہاں پہنچتے ہی مشکلات میں گھر گیا تھا۔ پہلے تو باپ کی موت کا صدمہ ہی کچھ کم نہ تھا اور اب پولیس اور کورٹ کے چکر نے اسے خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ باپ سے اس کے لاکھ اختلاف سہی لیکن بہرحال وہ اس کا باپ تھا۔

رسولن کی زبانی مجھے برکت کے بارے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ جس کے مطابق وہ ایک نہایت ہی معقول اور سمجھ دار شخص تھا۔ اس نے اپنا طویل بیان مکمل کیا تو میں نے رسولن سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں جرح شروع کی۔

"برکت صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ آپ اپنے والد کی دوسری شادی سے خوش نہیں تھے اور آپ نے ان سے عرصہ ہوا، قطع تعلق کر رکھا تھا پھر اپنی اچانک آمد کی وجوہات بتائیں گے؟"

"مجھے اعتراض ہے جناب!" وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز آواز میں کہا۔ "جناب عالی فاضل وکیل کا سوال غیر متعلق ہے موجودہ مقدمے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! یہ سوال غیر متعلق نہیں ہے۔ گواہ برکت نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ ملک نواز علی نے اسے کسی خاص مقصد کیلئے بہ اصرار یہاں بلایا تھا۔ اور اس بات کو اپنی بیوی بلقیس جہاں سے پوشیدہ رکھنے کی تاکید کی تھی بلکہ مقتول طبیعت خراب ہونے کے باوجود بھی علی الصباح اپنے بیٹے کو لینے خود ایئرپورٹ جانا چاہتا تھا۔ عدالت کے علم میں یہ بات آنا چاہئے کہ ایسی کون سی بات تھی جس کا ذکر مقتول نے اپنی بیوی سے بھی نہیں کیا تھا۔ یہ بات اب ملک صاحب سے تو پوچھی نہیں جا سکتی اگر وکیل استغاثہ ایسا کر سکتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

آخری جملہ میں نے دانستہ استغاثہ کے وکیل کو چڑانے کیلئے ادا کیا تھا۔ جج نے وکیل استغاثہ کا اعتراض رد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

"برکت صاحب، مقتول نے آپ کو بتایا تو ہو گا کہ اچانک اسے آپ کو بلانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"جی ہاں، انہوں نے اپنے وصیت نامے کا ذکر کیا تھا۔ وہ میری موجودگی میں نیا وصیت نامہ لکھوانا چاہتے تھے۔ یہ ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے فون پر مجھے بتایا تھا۔ حالانکہ کافی عرصے سے ہمارے درمیان برائے نام ہی رابطہ رہ گیا تھا۔ ممی کی ڈیتھ کے بعد میں ڈیڈی سے بالکل ہی متنفر ہو گیا تھا۔ میں تو ممی کی موت کا ذمہ دار بھی ڈیڈی ہی

کو سمجھتا ہوں۔ اگر وہ اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کر لیتے تو شاید وہ آسانی سے موت سے ہم کنار ہوتیں کیوں کہ ڈاکٹروں نے ممی کی متوقع موت کا اعلان تو بہت پہلے ہی کر دیا تھا۔" بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"نعیمہ خاتون کینسر ایسے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ غالباً اسپتال ہی میں ان کا انتقال ہوا تھا؟" یہ واقعی ایک غیر متعلق سوال تھا لیکن میں نے دانستہ یہ ذکر چھیڑا تھا۔ اس طرح برکت سے بہت مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ رسولن کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ برکت اپنی ماں کو بے انتہا چاہتا تھا۔ نعیمہ خاتون کے آخری سانسوں میں برکت اس کے پاس تھا۔ ملک نواز علی کو تو اپنے بزنس ہی سے فرصت نہیں تھی۔ وہ سمندر پار بستر مرگ پر پڑی نعیمہ پر کیا توجہ دیتا۔ پھر اب نعیمہ اس کے کسی مصرف کی بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی دل بستگی کیلئے بلقیس جہاں جو موجود تھی۔

"میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا تھا۔" برکت نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اس سے پیشتر بھی وہ نیویارک کے ایک معروف اسپتال میں کئی بار علاج کی غرض سے آ چکی تھیں۔ مرنے سے پہلے وہ "بون میرو ٹرانس پلانٹیشن" کے عمل سے بھی گزر چکی تھیں۔ اس سے پہلے تین مرتبہ ڈاکٹروں نے ان کا "بلڈ ٹرانس فیوژن" بھی کیا تھا۔

"جناب عالی، یہاں قتل کے مقدمے کی سماعت ہو رہی ہے نہ کہ ہم نعیمہ خاتون کی بیماری کی داستان سننے کیلئے اکٹھے ہوئے ہیں۔" وکیل استغاثہ کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔ "فاضل وکیل عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ اس طرح کی جذباتی کہانیاں سنا کر جانے وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔"

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا جائے۔"

میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "برکت صاحب! ملک صاحب نے آپ کی غیر موجودگی میں دوسری شادی کی تھی۔ یہاں آ کر آپ پہلی بار اپنی سوتیلی والدہ بلقیس جہاں سے ملنے والے تھے۔ آپ کو یقین تھا کہ آپ انہیں پہچان لیں گے؟"

"پہچان کا کیا سوال جناب!" برکت نے جلدی سے کہا۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا

تھا کہ ڈیڈی کے بجائے بلقیس جہاں میرے استقبال کیلئے ایئرپورٹ پر موجود ہوں گی۔ مجھے تو ڈیڈی نے خود خاص طور پر یہ بات کہی تھی کہ وہ میری آمد سے اپنی نئی منکوحہ کو بے خبر رکھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے دانستہ یہ سوال کیا تھا تا کہ یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر آ جائے۔

"آپ نے بلقیس جہاں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے خود کو کیا کہہ کر آپ سے متعارف کرایا تھا۔ میرا مطلب ہے، آپ نے کیسے یقین کر لیا کہ وہ آپ کے والد کی دوسری بیوی ہیں اور آپ نے ان کے ساتھ آنے پر رضامندی ظاہر کر دی حالانکہ بقول آپ کے، ملک صاحب نے آپ کی آمد کو بلقیس جہاں بیگم سے خفیہ رکھنے کا ذکر کیا تھا؟"

"انہوں نے میری تصویر سے مجھے پہچان لیا تھا۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جب میں نے پوچھا کہ ڈیڈی کیوں نہیں آئے تو انہوں نے بتایا کہ ڈیڈی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ میں نے یقین کر لیا اور ان کے ساتھ چلا آیا۔"

جج کئی بار گھڑی کی جانب دیکھ چکا تھا۔ میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "برکت صاحب، آپ نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ آپ کی فلائٹ تین گھنٹے لیٹ تھی۔ کیا آپ نے اس کی اطلاع ملک صاحب کو دی تھی؟"

اس نے نفی میں جواب دیا۔ "اس کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ مجھے بورڈنگ کارڈ مل چکا تھا جب معلوم ہوا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے فلائٹ میں آدھے گھنٹے کی تاخیر ہے پھر رفتہ رفتہ یہ آدھا گھنٹہ رینگتے ہوئے تین گھنٹوں تک پہنچ گیا تھا۔ ہمارے جہاز نے تین گھنٹے کی تاخیر سے پرواز کی تھی۔"

"آپ کو نارمل وے میں کتنے بجے کراچی ایئرپورٹ میں پہنچنا تھا؟ میرا مطلب ہے، اگر فلائٹ لیٹ نہ ہوتی تو آپ کتنے بجے پہنچ جاتے؟"

"صبح پانچ چھپن ارائیوال کا وقت تھا۔"

"یعنی جب آپ اپنے ملک کی سرزمین کو چھوتے تو فجر کی اذان ہو رہی ہوتی؟"

"میں یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

میں نے اس کے جواب کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ "بنگلے پر آپ کس وقت پہنچتے تھے؟"

"میں نے ایئرپورٹ کے پارکنگ لاٹ سے نکلتے ہوئے گھڑی دیکھی تھی میری گھڑی میں اس وقت دس بجے تھے۔ میں نے جہاز میں سوار ہوتے ہی اسے پاکستانی وقت کے مطابق سیٹ کرلیا تھا۔ ایئرپورٹ سے بنگلے کا راستہ بہ مشکل دس پندرہ منٹ کا ہوگا۔ اب آپ خود اندازہ لگالیں کہ ہم گھر کب پہنچے ہوں گے۔"

پھر عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔ جج نے آئندہ سماعت کی تاریخ دے دی۔

میں عدالت کے کمرے سے باہر آیا تو رسولن بی بی میرے ساتھ ساتھ تھی۔ میرو کو پولیس اپنی نگرانی میں لے گئی تھی۔ میں رسولن کو تسلی دے کر رخصت کرچکا تو مجھے کسی نے پیچھے سے آواز دے کر مخاطب کیا۔ "وکیل صاحب' ایک منٹ۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا' وہ برکت تھا۔ وہ تیزی سے میری طرف آرہا تھا۔ میں برآمدے ہی میں رک گیا۔ وہ اکیلا ہی میرے پاس آیا تھا۔ کچھ فاصلے پر بلقیس جہاں بھی کھڑی ہوئی مجھے نظر آگئی۔

"جی فرمایئے برکت صاحب' میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" برکت میرے نزدیک آیا تو میں نے استفسار کیا۔

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں وکیل صاحب!" اس نے شائستہ انداز میں کہا۔

"آپ کا نام۔۔۔؟"

میں نے کہا۔ "مجھے مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کہتے ہیں۔ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

وہ کن انکھیوں سے بلقیس جہاں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے پراسرار انداز نے میرے دل میں تجسس پیدا کردیا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "آپ کل میرے دفتر تشریف لے آئیں۔" میں نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔ "کل عدالت میں میرا کوئی کیس نہیں ہے۔ میں پورا دن اپنے دفتر ہی میں گزاروں گا۔ آپ گیارہ بجے کے بعد کسی بھی وقت تشریف لے آئیں۔"

اس نے چپکے سے کارڈ مجھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا پھر میرا شکریہ ادا کرتے

ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ وہ جب تک میرے پاس کھڑا رہا تھا' میں نے محسوس کیا تھا' اس دوران میں بلقیس جہاں بے چین نظروں سے ہماری جانب ہی دیکھتی رہی تھی۔ میں اس پر توجہ دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔

○

دوسرے روز ٹھیک گیارہ بجے وہ میرے دفتر میں موجود تھا۔ میں اس وقت اپنے ایک سابق موکل سے کسی معاملے پر بات چیت کر رہا تھا۔ جب میں فارغ ہوا تو میری سیکریٹری نے اسے میرے کمرے میں بھیج دیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ "بیگ صاحب' گزشتہ روز میں نے عدالت میں آپ کی پیشہ ورانہ مہارت کا عملی مظاہرہ دیکھا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "میں بھی آپ کی خدمات اپنے سلسلے میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"خیریت تو ہے؟" اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ "آپ کس سلسلے میں مجھے اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ ڈیڈی کے قاتل کو پھانسی پر لٹکوا دیں۔" وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"آپ غلط جگہ پر آگئے ہیں۔" میں نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرو میرا موکل ہے میرا کام اسے عدالت سے انصاف دلانا ہے۔ وہ بے گناہ ہے' اسے کسی گہری سازش کے تحت پھانسا گیا ہے اور انشاء اللہ میں اسے بری کرانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"میرا مطلب بھی یہی ہے وکیل صاحب!"

"میں سمجھا نہیں!"

اس نے سمجھایا۔ "میں بھی میرو کو بے گناہ سمجھتا ہوں۔ وہ اتنا بڑا قدم کسی بھی طرح نہیں اٹھا سکتا۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ رسولن کی خدمات میرے سامنے ہیں۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا۔ سوچتا ہوں تو سر میں ٹیسیں سی اٹھنے لگتی ہیں۔ آپ چاہیں اور کوشش کریں تو ڈیڈی کے قاتل تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"قاتل تک پہنچنا پولیس کا کام ہے۔ میرا کام تو اپنے موکل کو انصاف دلوانا ہے۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔ "اگر آپ میرو کو قاتل نہیں سمجھتے تو مجھے بتائیں' آپ کی نظر میں کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جو ملک صاحب کی جان کے درپے ہو؟"

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ برکت سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی تھی۔ وہ بولا۔ "میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے کافی عرصے سے ان کے معاملات میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ مجھے تعلیمی اخراجات کیلئے وہ باقاعدگی سے ایک معقول رقم بھیجتے رہتے تھے۔ میں نہیں جانتا ان دنوں کن کن لوگوں سے ان کے کیا کیا معاملات چل رہے تھے۔"

میں نے سوال کیا۔ "آپ نے عدالت میں کسی وصیت نامے کا ذکر کیا تھا؟"

وہ کچھ دیر تک پرخیال انداز میں خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ "ڈیڈی علم نجوم پر بہت اعتقاد رکھتے تھے اور کبھی کبھی وہ اس شہر کے ایک مشہور و معروف نجومی کے پاس اپنا زائچہ بنوانے کیلئے جایا کرتے تھے۔ ڈیڈی نے جب مجھے پاکستان بلانے کیلئے اصرار کیا تھا تو بتایا تھا کہ ان کے نجومی نے ان کیلئے خراب وقت کی پیش گوئی کی تھی اور کچھ مفید مشورے بھی دیئے تھے۔ ڈیڈی نجومی کے ان مشوروں کی روشنی میں اپنی وصیت میں کچھ تبدیلی کر کے نئی وصیت لکھوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے وکیل کو بھی اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا اور بس میری آمد کا انتظار تھا پھر میں آیا تو۔۔۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی حالت ذرا سنبھلی تو میں نے کہا۔ "برکت صاحب' آپ ذرا سوچ کر ٹھیک ٹھیک بتائیں۔۔۔" میں نے جملہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کے ڈیڈی کی موت سے کس شخص کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ میرا مطلب ہے' ان کی دولت' جائیداد اور کاروبار وغیرہ کس کے حصے میں آتا؟"

"ظاہر ہے' ان کی بیوی بلقیس جہاں اور میں' ان کا بیٹا ہی دو ایسے افراد ہو سکتے ہیں

جو ان کی وفات کے بعد ہر چیز کے حق دار ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ ملک صاحب جس وصیت نامے میں تبدیلی کے خواہاں تھے اس میں درج وصیت کی نوعیت کیا تھی؟"

"میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔"

"ملک صاحب کے وکیل کو ملک صاحب کی موت کا پتہ تو چل گیا ہو گا۔ آپ کی ان سے ملاقات ہوئی؟"

"میری فون پر ان سے بات ہو چکی ہے لیکن ابھی ملاقات نہیں ہو سکی۔" برکت نے بتایا۔ "نو جنوری کی صبح سڑک پار کرتے ہوئے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نے انہیں ٹکر مار دی تھی جس کے نتیجے میں ان کی دائیں ٹانگ میں فریکچر ہو گیا تھا۔ وہ اس روز سے بیڈ پر پڑے ہوئے ہیں۔ اب میں ان سے گھر پر ہی ملاقات کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

حادثے کے بارے میں سن کر میں چونک پڑا اور فوری طور پر میرا ذہن ایک شناسا وکیل فیروز چغتائی کی طرف چلا گیا۔ میں نے پوچھا۔ "ملک صاحب کے وکیل کا نام فیروز چغتائی تو نہیں ہے؟"

"جی ہاں' بالکل۔ آپ انہیں جانتے ہیں کیا؟"

"چند پیشہ ورانہ ملاقاتیں رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "آج شام گھر پر ان سے مل لیا جائے تو کیسا رہے گا؟"

"بہت اچھا رہے گا اگر آپ چاہیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟"

"ضرور چلیں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "فیروز چغتائی صاحب اس کیس میں ہماری خاصی مدد کر سکتے ہیں۔"

کچھ دیر ہمارے درمیان اس کیس سے متعلق گفتگو ہوتی رہی پھر دوبارہ آنے کا کہہ کر برکت رخصت ہو گیا۔

فیروز چغتائی سے مجھے بہت کارآمد معلومات حاصل ہوئیں۔ اس نے کچھ ایسی باتیں بھی بتائیں جن سے میرے بعض شکوک یقین میں بدل گئے۔ میں نے اس کیس کے بارے میں جو اندازے قائم کئے تھے' فیروز چغتائی سے ملاقات کے بعد ان کی تصدیق ہو گئی

تھی۔ اگلی ساعتوں کے دوران یہ باتیں رفتہ رفتہ کھل کر سامنے آتی چلی گئیں۔

○

عدالتی کارروائیاں اور ان کی تفصیلات' مقدمات کی طوالت' پیشیاں' قانونی ضابطے سب بے انتہا صبر آزما چیزیں ہیں۔ کبھی جج موجود نہیں ہے تو کبھی وکیل غیر حاضر ہے۔ پھر ہر عدالت میں کیسوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ پیش کار کے "تعاون" کے بغیر تو باری آنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ باری آ بھی جائے تو ممکن ہے کوئی اور پیچیدگی پیدا ہو جائے۔ بعض اوقات سب کچھ موجود ہوتا ہے لیکن جس گواہ کی باری ہوتی ہے وہ غیر حاضر ہوتا ہے۔ الغرض خدا' دشمن کو بھی عدالتوں کے چکر سے بچائے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ قارئین تک صرف کیس سے متعلق ضروری چیزیں ہی پہنچ سکیں۔ غیر ضروری تفصیلات اور مقدمات کی بوریت میں مبتلا کر دینے والی کارروائیوں کے بیان سے میں پرہیز کرتا ہوں۔

آج کی پیشی میں بلقیس جہاں کی گواہی ہونا تھی۔ بلقیس جہاں اس کیس میں میرے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ میں نے اب تک جو محنت کی تھی اس کے نتیجے میں بلقیس جہاں کو میں نے اپنے خصوصی ٹارگٹ کیلئے چن لیا تھا۔ وہ حلفیہ بیان دینے کے بعد فارغ ہوئی تو میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

"محترمہ بلقیس جہاں! مقتول کے بیٹے برکت نے بتایا ہے کہ مقتول نے اپنے بیٹے کی آمد سے آپ کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ دانستہ آپ سے یہ بات چھپانا چاہتا تھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"برکت کا بیان جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اسے یہ جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"یعنی آپ مقتول کے بیٹے کی آمد سے باخبر تھیں۔ میرا مطلب ہے مقتول نے آپ کو سب کچھ بتا رکھا تھا؟"

"وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔"

"محترمہ بلقیس جہاں' آپ نے بتایا ہے کہ برکت نے جھوٹا بیان دیا ہے۔ آپ

عدالت کو بتائیں گی کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے' برکت مجھ سے جیلس ہے۔"

"اس کی وجہ؟"

اس نے امداد طلب نظروں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا' فاضل وکیل نے عدالت سے کہا۔ "جناب عالی! وکیل صفائی گواہ کو غیر ضروری سوالات میں الجھا کر عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"میں نے کوئی غیر ضروری سوال نہیں کیا جناب۔" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سوال کا جواب بہت ضروری ہے۔ مقتول نے اپنے بیٹے کو کسی ضروری کام کیلئے بلایا تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں اپنی وصیت میں کوئی تبدیلی کرانا چاہتا تھا۔ یہ بات اس نے اپنی اہلیہ سے بھی پوشیدہ رکھی تھی۔ یہ حقیقت بھی عدالت کے علم میں آ چکی ہے کہ برکت مقتول کی بلقیس جہاں سے شادی پر خوش نہیں تھا۔ وہ اپنی والدہ نعیمہ خاتون کی موت کا ذمے دار مقتول کو سمجھتا تھا۔ اسی حوالے سے وہ بلقیس جہاں کو سخت ناپسند کرتا تھا پھر بلقیس جہاں وہ ہستی ہیں جس نے مقتول کو آخری بار زندہ دیکھا تھا۔"

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "محترمہ بلقیس جہاں' آپ کے خیال میں برکت آپ سے جیلس ہے۔ اس نے دشمنی میں ایسا بیان دیا ہے جس سے آپ کی شخصیت مشکوک ہو جاتی ہے حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ برکت کون سی تاریخ اور کون سی فلائٹ سے پاکستان پہنچ رہا ہے' یعنی مقتول نے آپ کو سب کچھ بتا رکھا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"محترمہ بلقیس جہاں' آپ کے چوکیدار بندوق خان کے بیان سے برکت کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مقتول نے برکت کو بتا رکھا تھا کہ وہ خود ایئرپورٹ پر اسے لینے کیلئے جائے گا پھر آپ کیسے ایئرپورٹ پہنچ گئیں؟"

”جناب عالی، معلوم ہوتا ہے فاضل وکیل کی یادداشت خاصی کمزور ہو چکی ہے۔“ وکیل استغاثہ نے بیچ میں ٹانگ پھنساتے ہوئے کہا۔ ”بندوق خان نے پولیس کو بتایا تھا کہ اس نے مقتول کے بجائے جب بلقیس جہاں کو ایئرپورٹ کیلئے روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تو اس کی وجہ دریافت کی تھی اور بلقیس جہاں نے کوئی وجہ بتائی بھی تھی۔۔۔ وکیل صاحب، ذرا ذہن پر زور دیں۔“

”ذہن پر زور دینے کی آپ کو زیادہ ضرورت ہے وکیل صاحب!“ میں نے مسکرا کر وکیل استغاثہ سے کہا۔ ”آپ اپنا ریکارڈ درست فرمالیں۔ گواہ بندوق خان فاضل عدالت میں اس بات سے انکار کرچکا ہے کہ اس نے اس نوعیت کا کوئی بیان پولیس کو دیا تھا۔“

”غیر ضروری بحث سے پرہیز کیا جائے۔“ جج نے حکم دیا پھر مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کردیا۔

میں نے کہا۔ ”محترمہ بلقیس جہاں، آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ برکت علی الصباح کراچی پہنچ رہے ہیں؟“

”مجھے ملک صاحب نے بتا رکھا تھا اور انہی کے کہنے پر میں ایئرپورٹ گئی تھی۔“

”آپ نے گھر سے نکلتے وقت یہ تصدیق کرلی تھی کہ فلائٹ اپنے وقت پر پہنچ رہی ہے؟“

”میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”گویا آپ کو ایئرپورٹ پر پہنچ کر معلوم ہوا تھا کہ فلائٹ تین گھنٹے لیٹ تھی؟“

”جی ہاں۔“

”محترمہ بلقیس جہاں، آپ نے ایئرپورٹ کے باہر تین گھنٹے انتظار کرنے کو کیوں ترجیح دی۔ آپ واپس آکر یہ تین گھنٹے آرام سے گھر میں گزار سکتی تھیں، آپ کے گھر سے بہ سہولت پندرہ منٹ میں ایئرپورٹ پہنچا جا سکتا ہے؟“

”آپ مجھے اس جرم میں پھانسی چڑھوا دیں جناب وکیل صاحب!“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”آپ خواہ مخواہ مجھے پریشان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”بی بی! آپ سے جو پوچھا جا رہا ہے، اس کا جواب دیں۔“ جج نے بلقیس جہاں سے کہا۔

وہ بولی۔ ”میری مرضی۔ میں نے جو کیا اپنی مرضی سے کیا۔ آپ کو میرے ایئرپورٹ پر انتظار کرنے پر کیا اعتراض ہے؟“ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

”کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ میں نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ”محترمہ بلقیس جہاں، جب آپ ایئرپورٹ جانے کیلئے روانہ ہو رہی تھیں، اس وقت مقتول کیا کر رہا تھا؟“

”وہ سو رہے تھے۔ رات بھر وہ شدید بے چینی میں مبتلا رہے تھے۔ کوئی چار بجے ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔“ اس کے لہجے میں بیزاری عیاں تھی۔

”آپ نے گھر سے نکلتے وقت انہیں اپنی روانگی کے بارے میں مطلع کیا تھا؟“

”میں نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“

میں نے اپنے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”محترمہ بلقیس جہاں، جس خنجر سے آپ کے شوہر کو قتل کیا گیا، آپ کے بقول وہ خنجر ملزم میرو کی ملکیت ہے۔ پولیس کو آپ نے یہی بیان دیا تھا۔ آپ فاضل عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ کیسے جانتی تھیں، وہ خنجر میرو کا تھا؟“

”میں نے ایک مرتبہ اسے میرو کے پاس دیکھا تھا۔“

”یہ واردات سے کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے؟“

”دو ماہ پہلے۔“ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

”یعنی دو ماہ پیشتر۔۔۔ دیکھا ہوا خنجر آپ کی یادداشت میں محفوظ رہ گیا تھا اور آپ نے اسے دوبارہ دیکھتے ہی پہچان لیا۔“

”اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟“ وہ مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو میری یادداشت پر شبہ کیوں ہے؟“

”یقیناً آپ کی یادداشت بہت اچھی ہے۔“ میں نے اس کی بات کا برا منائے بغیر کہا۔ ”آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ واردات سے پندرہ بیس روز پہلے ملزم کی والدہ نے یہی خنجر آپ کے حوالے کیا تھا اور آپ نے اس خطرناک ہتھیار کو کہیں پھینک دینے کا وعدہ کیا تھا؟“

”میری یادداشت میں ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے۔“ وہ پراعتماد لہجے میں بولی۔

"آپ کو کسی نے مس گائیڈ کیا ہے۔"

"مثلاً۔۔۔ مجھے کون مس گائیڈ کر سکتا ہے؟"

"رسولن۔۔۔" اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ بات بناتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "میرا مطلب ہے رسولن اپنے بیٹے کو بچانے کیلئے کوئی بھی جھوٹی کہانی گھڑ سکتی ہے۔"

"محترمہ بلقیس جہاں! پولیس نے اپنی رپورٹ میں قتل کا محرک محبت اور رقابت کو قرار دیا ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ "وکیل صفائی ایک باعزت خاتون پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی جناب عالی!" میں نے جج کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے پولیس کے موقف کا ذکر کیا تھا۔ کوئی شخص بلاجواز قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب نہیں کرتا۔ ہر قتل کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی محرک موجود ہوتا ہے۔ پولیس نے میرے موکل کو قاتل ٹھہرایا ہے۔ قتل کے محرک پر بات کرنے سے بلقیس جہاں کی ہتک عزت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ فاضل وکیل سے میری استدعا ہے کہ وہ اپنی توانائی کو بچا کر رکھیں۔ انہیں بھی عدالت پورا پورا موقع دے گی۔ ابھی تو انہیں ملزم اور صفائی کے گواہوں پر جرح کرنا ہے۔"

"بیگ صاحب، آپ سوالات کا سلسلہ جاری رکھیں۔" جج نے گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے خود احساس تھا اور میری کوشش تھی کہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام نمٹا دوں۔ میں نے آج کی سماعت کیلئے خوب اچھی طرح تیاری کر رکھی تھی۔ ایڈووکیٹ فیروز چغتائی سے ملاقات کے بعد میں خود کو خاصا پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں جلد یا بدتر اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ فیروز چغتائی کے خدشات اور رسولن کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں اب تک میں خاصی تحقیق کر چکا تھا اور اس کیس کی گمشدہ کڑیاں تلاش کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اپنی اس عرق ریزی کو قانونی لباس پہنا کر عدالت کے کمرے میں پیش کرنے کا کام باقی تھا۔ سو اس کیلئے میری

جدوجہد جاری تھی، مجھے یقین تھا جلد یا بدیر میں اصل قاتل کو بے نقاب کر لوں گا۔ میں نے جج کی ہدایت کے مطابق اپنے سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"محترمہ بلقیس جہاں! آپ نے ملک نواز علی سے جس وقت شادی کی، تب آپ کی عمر کیا تھی؟"

"تقریباً بائیس سال۔"

"آپ کے خیال میں ملک صاحب کی عمر شادی کے وقت کیا ہو گی؟"

"لگ بھگ پچاس سال۔" بلقیس جہاں نے بتایا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ "محترمہ بلقیس جہاں! کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے ملک نواز علی سے دولت کے لالچ میں شادی کی تھی؟"

"یہ بات جھوٹ ہے۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔ "ملک صاحب مجھ سے محبت کرتے تھے۔"

"ملک صاحب آپ سے محبت کرتے تھے یا نہیں کرتے تھے، میں نے آپ سے یہ نہیں پوچھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے ملک صاحب سے شادی کرنے کا فیصلہ کس بنا پر کیا تھا؟"

وہ جزبز ہو کر بولی۔ "مجھے بھی ان سے محبت ہو گئی اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔"

"محبت کرنا واقعی کوئی جرم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "محترمہ بلقیس جہاں! کیا یہ بات کچھ عجیب سی محسوس نہیں ہوتی کہ آپ جیسی حسین و جمیل لڑکی کسی بدصورت شخص سے محبت کرنے لگے جب کہ اس کے آس پاس ہی اس پر جان نچھاور کرنے والا ایک وجیہہ شخص موجود ہو؟"

جج نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ بلقیس جہاں کے چہرے پر بھی ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "محترمہ بلقیس جہاں، کیا آپ کی شادی آپ کے والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے، آپ کے والدین آپ کے اس فیصلے سے خوش تھے؟"

اس نے پریشان نظروں سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا، وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! مجھے اعتراض ہے فاضل وکیل، محترمہ وکیل جہاں کی

کی ذاتیات پر حملہ کر رہے ہیں۔ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ کسی سے بھی محبت کر سکتا ہے
اور اپنی پسندیدہ شخصیت سے شادی پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ فاضل وکیل اپنے
سوالات سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو بجا جانا پھر مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب' آپ
وضاحت کریں۔"

میں نے کہا۔ "جناب عالی! یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ مقتول ملک نوا
علی نے خاصی رنگین زندگی گزاری' ایسی شہرت رکھنے والے شخص کی جانب عام طور
شادی کی نیت سے لڑکیاں مائل نہیں ہوتیں۔ جبکہ وہ نہ صرف بدصورت ہو بلکہ معمر بھ
ہو' کسی خاص مقصد کے بغیر کوئی خوب صورت لڑکی ایسے شخص سے شادی کیلئے تیار نہیں
ہو سکتی۔"

"محبت ایک بے غرض جذبے کا نام ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے فوراً اٹھ
کر کہا۔ "فاضل وکیل محبت کی توہین کر رہے ہیں۔"

"محبت کی توہین کو میں گناہ عظیم سمجھتا ہوں وکیل صاحب!" میں نے ایک ایک لف
پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے محترمہ بلقیس جہاں کے محبت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں
ہے بلکہ محبت کی توہین پر اعتراض ہے۔"

"کیا مطلب؟" وکیل استغاثہ اچھل پڑا۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں جو کہنا چاہتا ہوں وہی کہا۔ "محترمہ بلقیس جہاں' ملک نواز علی سے شاد
کرنے سے پہلے بھی کسی کی محبت میں گرفتار تھیں۔"

عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سب کی نظریں کٹہرے میں کھڑی بلقیس پر آ
ہوئی تھیں۔

"اپنی بات کی وضاحت کریں بیگ صاحب!" جج نے کہا۔

میں نے بلقیس جہاں سے پوچھا۔ "محترمہ' کیا یہ سچ ہے کہ ملک نواز علی سے شاد
کرنے سے پیشتر آپ شعیب درانی نامی کسی شخص سے محبت کرتی تھیں؟"

"یہ جھوٹ ہے' میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔" وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی
"آپ بکواس کرتے ہیں۔ آپ انہی وکیلوں میں سے ہیں جو سیاہ کو سفید اور سفید کو۔

ثابت کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔"

"بی بی' جذباتی گفتگو سے پرہیز کریں۔" جج نے بلقیس جہاں کو ہدایت کی پھر مجھ سے
کہا۔ "بیگ صاحب' آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔"

میں نے محسوس کیا تھا کہ جب سے میں نے بلقیس جہاں کی شادی کا تذکرہ چھیڑا تھا'
جج خصوصی طور پر اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے بلقیس جہاں کی جانب رخ پھیر کر
کہا۔ "محترمہ بلقیس جہاں' کیا یہ سچ ہے کہ نو جنوری کی رات شعیب درانی آپ کے بنگلے
پر موجود تھا؟"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ وہ اکثر و بیشتر ہمارے گھر پر آتا رہتا تھا۔ جب سے
ملک صاحب بیمار رہنے لگے تھے' وہ باقاعدگی سے فیکٹری نہیں جا پاتے تھے اس لیے مجبوراً
شعیب کو ضروری ہدایات کیلئے گھر آنا پڑتا تھا۔ آپ ہمارے مینیجر کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں
وکیل صاحب!"

"یہ بھی بتا دوں گا محترمہ!" میں نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ "آپ یہ بتائیں کہ نو
جنوری کی رات شعیب درانی کتنے بجے تک آپ کے بنگلے پر رہا تھا؟"

"ڈنر اس نے ہمارے ساتھ ہی کیا تھا۔ میرا خیال ہے' وہ کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ
بجے رخصت ہوا ہو گا۔"

"محترمہ بلقیس جہاں' آپ ملک صاحب کے کاروبار سے بڑی حد تک واقفیت
رکھتی ہیں۔ شادی سے پہلے آپ ان کی سیکریٹری بھی رہ چکی ہیں۔ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں
گی کہ شعیب درانی کو ملک صاحب کتنی تنخواہ دیتے تھے؟"

"تیس ہزار!" بلقیس جہاں نے جواب دیا۔

"محترمہ بلقیس جہاں' آپ نے پولیس میں جو رپورٹ درج کرائی تھی اس میں ملک
نواز علی کے قتل کے علاوہ یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ کے گھر سے ایک لاکھ روپے بھی
چوری ہوئے تھے جو مقتول نے وقوعہ سے ایک روز پیشتر کپڑوں کی الماری میں رکھے تھے۔
آپ بتا سکتی ہیں کہ اتنی بڑی رقم یوں ہی کپڑوں کی الماری میں کیوں رکھ دی گئی تھی؟"

"آپ کیلئے یہ بہت بڑی رقم ہو گی!" وہ رعونت سے بولی۔ "اور آپ کے سوال کا
مناسب جواب تو ملک صاحب ہی دے سکتے تھے۔"

"ملک صاحب جواب دینے کے قابل ہوتے تو پھر اس کھٹ راگ کی ضرورت ہی کیا تھی۔" میں نے معنی خیز نظروں سے بلقیس جہاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "محترمہ بلقیس جہاں' آپ سے میرا آخری سوال ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔" میں نے بلقیس جہاں کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "دس جنوری کی تاریخ میں شعیب درانی نے اپنے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپے جمع کرائے تھے' آپ اس بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟"

"یہ۔۔ تو آ۔۔ آپ۔۔ شعیب درانی ہی سے پوچھیں۔" الفاظ بڑی مشکل سے اس کے حلق سے برآمد ہوئے۔ میں نے بغور دیکھا' اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اپنے قدموں پر کھڑے رہنا اس کیلئے دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ کٹہرے کی دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"شعیب درانی سے بھی پوچھ لیں گے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے استدعا کی۔ "جناب عالی' محترمہ بلقیس جہاں کے بیان کے مطابق مقتول ملک نواز علی کا مینجر شعیب درانی نو جنوری کی رات کو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک ان کے گھر پر موجود تھا۔ فاضل عدالت جانتی ہے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق ملک نواز علی کی موت دس جنوری کی صبح چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی۔ لیکن مینجر شعیب درانی کی بنگلے سے روانگی اور ملک صاحب کی موت کے درمیان تقریباً پانچ گھنٹے کا وقفہ حائل ہے۔ مقتول کی بیوہ بلقیس جہاں نے اپنے بیان میں یہ بھی بتایا ہے کہ مقتول نواز علی وقوعہ کی رات طبیعت کی خرابی کے باعث دیر تک بے چینی میں مبتلا رہے تھے اور چار بجے کے قریب ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔ صبح ایئرپورٹ جاتے وقت بلقیس جہاں نے مقتول کو جگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس طرح دیکھا جائے تو مقتول نواز علی کی بیوہ کے علاوہ مینجر شعیب وہ واحد شخص ہے جس سے مقتول نواز علی نے اپنی موت سے پہلے ملاقات کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جو سردست بیان نہیں کی جا سکتیں۔ میں فاضل عدالت سے التماس کرتا ہوں کہ وہ مقتول کے مینجر شعیب درانی کو پابند گواہ کی حیثیت سے بہ ذریعہ سمن عدالت میں بیان دینے کیلئے طلب کرے۔"

وکیل استغاثہ نے میری درخواست پر کوئی اعتراض نہیں کیا لہٰذا جج نے شعیب

درانی کے نام سمن جاری کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

بلقیس جہاں کی گواہی کے بعد جج نے آئندہ تاریخ تک سماعت ملتوی کر دی۔

○

ملک نواز علی مرڈر کیس کو عدالت میں لگے ہوئے کم و بیش پانچ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران میں مجھے بہت مصروف رہنا پڑا تھا۔ میرے تین چار اور کیس بھی مختلف عدالتوں میں چل رہے تھے۔ مگر میرے لیے سب سے دلچسپ کیس یہی تھا اور میں نے اس کیس کی تیاری کیلئے روز و شب ایک کر دیئے تھے۔ کسی بے گناہ کو بری کروانے میں مجھے جو تسکین حاصل ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ جب سے میں نے مقتول کے وکیل فیروز چغتائی سے تفصیلی ملاقات کی تھی' میں بہت پرامید ہو گیا تھا کہ آخر کار اپنے موکل کو انصاف دلوانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اسی سلسلے میں ایک روز میں اس اخبار کے دفتر بھی جا پہنچا جس نے ملک نواز علی کے قتل کو باتصویر بڑی تفصیل سے شائع کیا تھا۔ مذکورہ اخبار کے ایک نیوز ایڈیٹر سے میری دیرینہ شناسائی تھی پھر جس بینک میں مقتول کے مینجر شعیب درانی کا اکاؤنٹ تھا اس بینک کے مینجر سے مل کر بھی مجھے مفید معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

اگلی پیشی پر میں نے وکیل استغاثہ کو اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع دیا۔ صفائی کے گواہوں میں میرو کا دوست مظفر علی اور میرو کی والدہ رسولن بی بی شامل تھے۔ وکیل استغاثہ نے گھما پھرا کر بہت سے سوالات کئے مگر اسے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ گواہ مظفر علی نے وقوعہ کی رات ملزم کی اپنے گھر موجودگی کی تصدیق کر دی تھی۔ ملزم کی ماں نے بھی اپنے بیٹے کی بے گناہی کیلئے بہت کچھ کہا تھا مگر اس کی گواہی کا زیادہ تر حصہ جذبات سے مغلوب جملوں پر مشتمل تھا۔ اس روز کی عدالتی کارروائی میں ایسی کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی جس کے بیان کو ضروری سمجھا جائے۔ تاہم مقتول کا مینجر شعیب درانی بھی اس روز عدالت میں موجود تھا مگر اس روز میری باری نہ آ سکی۔ وکیل استغاثہ نے اتنا زیادہ وقت لے لیا تھا کہ عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ میں نے جج سے درخواست کی کہ آئندہ پیشی پر میں شعیب درانی پر جرح کرنا چاہتا ہوں۔ جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ

دے دی۔

ایک ماہ بعد میں پھر اسی عدالت میں موجود تھا۔ اس کیس کے باقی کردار پہلے وہاں موجود تھے۔ میں نے اپنی حاضری لگائی اور پیش کار سے اپنے نمبر کے بارے میں دریافت کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ دوسرا نمبر ہمارا ہے۔ اسی دوران میں ملزم میرو بھی تفتیشی افسر کی نگرانی میں عدالت میں آ پہنچا۔ میں نے تفتیشی افسر سے کہا۔ ''آج میں ایک خصوصی کردار پر جرح کروں گا' میری جرح کو ذرا دھیان سے سننا۔ ہو سکتا ہے تمہیں اس سے کچھ مدد مل جائے۔''

''جانے دیں وکیل صاحب۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ ہمیں ہمارا کام سکھانے کی کوشش نہ کریں۔ ہمارا کام مکمل ہو چکا ہے۔ آپ ہمیں مشورہ دینے کی بجائے عدالت میں زور آزمائی کریں۔ شاید کوئی بات بن جائے۔ ویسے جج صاحب آپ کی لچھے دار باتوں سے متاثر ہونے والے نہیں ہیں۔ ہم نے بڑا زور دار چالان پیش کیا ہے۔''

''اچھا!'' میں نے مسکراتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ ''چلو ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی۔''

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو چپراسی نے برآمدے میں جا کر آواز لگائی۔ ''شعیب درانی ولد مجیب درانی عدالت میں حاضر ہو۔''

چند لمحوں کے بعد شعیب درانی عدالت کے کمرے میں داخل ہوا اور بڑے قدموں سے چلتے ہوئے کٹہرے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے کٹہرے میں ملزم امیر عرف میرو پہلے سے موجود تھا۔ وکیل استغاثہ بھی آ چکا تھا۔ شعیب درانی کا مختصر بیان ہوا تو جج نے مجھے جرح کا اشارہ کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''شعیب درانی صاحب! وقوعہ کی رات آپ اپنے باس سے کس سلسلے میں آئے تھے؟''

''سلسلہ کیا ہوگا ظاہر ہے' میں ان کا مینیجر تھا۔ کام ہی کے سلسلے میں آیا تھا۔''

''میں کام کی نوعیت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

اس نے بتایا۔ ''کچھ ضروری کاغذات پر ملک صاحب کے دستخط ہونا ضروری ملک صاحب چند روز سے فیکٹری نہیں جا رہے تھے اس لئے مجھے خود حاضر ہونا پڑا۔''

''شعیب درانی صاحب! جس رات ملک نواز علی کو قتل کیا گیا اس روز آپ کتنے بجے ان کے گھر پہنچے تھے؟''

''شام چھ بجے۔''

''آپ کی روانگی کتنے بجے ہوئی تھی؟''

''غالباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔''

''شعیب درانی صاحب! آپ مقتول کے ملازم تھے انہوں نے آپ کو اپنی فیکٹری کا مینیجر بنا رکھا تھا۔ کیا اس کے علاوہ بھی آپ کا مقتول سے کوئی تعلق تھا؟''

''نہیں' ہمارے درمیان صرف مالک اور ملازم کا ہی تعلق تھا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

''اس کے باوجود بھی آپ اکثر و بیشتر ان سے گھر پر ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے؟''

وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں اس کی وجہ بتا چکا ہوں۔''

''شعیب درانی صاحب!'' میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ وقوعہ کی رات لگ بھگ پانچ گھنٹے مقتول کے گھر پر موجود رہے۔ آپ عدالت کو بتائیں گے کہ کاغذات پر دستخط کے بعد اتنی دیر کیوں لگ گئی؟''

اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ بولا۔ ''دستخط تو چند منٹ میں ہو گئے تھے۔ ملک صاحب نے مجھے ڈنر کے لیے روک لیا تھا پھر باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور گیارہ بج گئے۔''

''شعیب درانی صاحب' کیا آپ کی مقتول کے ساتھ ایسی بے تکلفی تھی کہ وہ ڈنر پر آپ کو روک لیں؟''

''وہ بہت ہمدرد اور خوش اخلاق انسان تھے۔ میرے ساتھ بڑے حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔''

''گویا آپ اکثر دیر دیر تک ان کے گھر پر رک جایا کرتے تھے؟''

''جی ہاں!'' وہ میرے سوال پر گڑبڑا گیا پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ''ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ عام طور پر میں زیادہ دیر ان کے پاس نہیں رکتا تھا۔''

"شعیب درانی صاحب! آپ نے عدالت کو بتایا کہ وقوعہ کی رات ملک نواز علی سے گفتگو کے دوران میں آپ کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا یعنی آپ تقریباً پانچ گھنٹے تک ان سے باتیں کرتے رہے تھے۔ یہ بات بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان دنوں ملک صاحب کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی اور وہ بہت کم فیکٹری جاتے تھے اس لئے آپ کو بار بار ان کے بنگلے پر آنے کی زحمت اٹھانا پڑتی تھی۔ آپ فاضل عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ ایسی کون سی دلچسپ باتیں تھیں جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں اور ملک صاحب بھی خراب طبیعت، کے باوجود ان باتوں میں مگن تھے؟"

وہ تھوک نگل کر بولا۔ "ملک صاحب مارکیٹ میں ایک نئی پروڈکٹ لانا چاہ رہے تھے۔ ہماری فیکٹری میں سلک، جارجٹ اور ٹشو تیار کیا جاتا ہے۔ اب ملک صاحب نے اور گنزا نام کے ایک اور کپڑے کی تیاری کا منصوبہ بنایا تھا۔ ہم اسی سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے۔"

میں نے اچانک سوال کیا۔ "شعیب درانی صاحب! بلقیس جہاں آپ کو کیسی لگتی ہیں؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وکیل استغاثہ نے تیزی سے کہا۔ "جناب عالی! مجھے اعتراض ہے۔ فاضل وکیل مقدمے کی اہم گواہ کی توہین کر رہے ہیں اور غیر ضروری سوال کر کے عدالت کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ ٹو دی پوائنٹ سوال کریں۔"

میں نے جج کی ہدایت کو مدنظر رکھتے ہوئے سوال کیا۔ "شعیب درانی صاحب! آپ وقوعہ کی رات ملک صاحب کے بنگلے سے رخصت ہونے کے بعد کہاں گئے تھے؟"

"ظاہر ہے، مجھے اپنے گھر ہی جانا تھا اور کہاں گیا ہوں گا؟"

اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ جج نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دیں۔"

وہ بولا۔ "میں اپنے گھر گیا تھا۔"

"شعیب درانی صاحب! آپ کی رہائش کس علاقے میں ہے؟"

"ناظم آباد میں۔"

"آپ کتنے بجے گھر پہنچے تھے؟"

"فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ صحیح وقت کا مجھے اندازہ نہیں ہے۔" وہ روانی میں کہہ گیا اور اگر ایسا نہیں تھا تو اس کی ڈھٹائی دیدنی تھی۔

"شعیب درانی صاحب! پی ای سی ایچ ایس سے ناظم آباد پہنچنے کیلئے زیادہ سے زیادہ پینتالیس منٹ درکار ہوتے ہیں۔ آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کو یہ فاصلہ طے کرنے کیلئے تقریباً سات گھنٹے کیوں لگ گئے؟ کیا آپ نے یہ سفر پیدل طے کیا تھا؟"

"جی ہاں، یوں ہی سمجھ لیجئے۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے پر آ کر گزرنے والے رنگ سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا مگر وہ مکاری سے اپنی بات نبھانے پر تل گیا تھا۔

"آپ سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے، اس کا جواب دیں۔" جج نے سرزنش کی۔

"غریب آباد کے قریب اچانک میری گاڑی بند ہو گئی تھی۔ میں دیر تک اسے اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوششوں میں لگا رہا پھر قریب کے پٹرول پمپوں پر بھی گیا مگر کہیں بھی کوئی مکینک دستیاب نہیں ہو سکا۔ اسی دوران میں پولیس کی ایک گاڑی وہاں آ گئی۔ دفتر کی گاڑی میں کاغذ پورے نہیں تھے۔ وہ مجھے دھمکیاں دینے لگے اور آخر میری جامہ تلاشی لے کر جیب سے چار سو روپے نکال کر لے گئے۔ میں بہت دیر تک وہاں پریشان رہا، آخر سبزی منڈی سے آنے والی ایک سوزوکی کے ڈرائیور کی مدد سے اپنی گاڑی کو باندھ کر گھر پہنچا تو مسجدوں سے اذان کی صدائیں آ رہی تھیں۔"

اس نے رک رک کر سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے ایک مربوط کہانی گھڑ ڈالی۔

"میں نے پوچھا۔ "شعیب درانی صاحب، آپ کو ملک صاحب کی موت کے بارے میں کب پتہ چلا؟"

"دوپہر میں بلقیس جہاں صاحبہ نے فون پر بتایا تھا۔"

"آپ نے وہ فون کال کہاں ریسیو کی تھی۔ میرا مطلب ہے آپ اس وقت کہاں تھے جب آپ کو ملک صاحب کی موت کی خبر ملی؟"

اس نے بتایا۔ "اس وقت فیکٹری میں تھا۔"

"آپ عموماً کتنے بجے فیکٹری میں پہنچ جاتے ہیں؟"

"دس بجے تک۔" وہ بے ساختہ بولا پھر اپنے بیان میں اضافہ کیا۔ "لیکن دس جنوری کو میں ساڑھے گیارہ بجے فیکٹری پہنچا تھا۔ رات بھر کی بیگار کے بعد ایسا سویا کہ دس بجے سے پہلے آنکھ ہی نہیں کھل سکی۔"

"شعیب درانی صاحب! ملک صاحب آپ کو کتنی تنخواہ دیتے تھے؟"

"تیس ہزار روپے!" اس نے بتایا پھر بولا۔ "اس کے علاوہ بھی ملک صاحب پانچ ہزار روپے ماہانہ بہ صورت چیک دیا کرتے تھے جس کا سیلری رجسٹر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ملک صاحب نے ہدایت کر رکھی تھی کہ میں اس رقم کا ذکر دوسرے ملازمین سے نہ کروں۔"

لوہا گرم ہو چکا تھا' میں نے ایک بھرپور چوٹ لگائی۔ "شعیب درانی صاحب! دس جنوری کو آپ کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپے جمع کرائے گئے تھے۔ اس کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟"

وہ رٹو طوطے کی طرح فرفر بولا۔ "وہ ملک صاحب نے مجھے دیئے تھے۔" اس کی پیشانی پر خنکی کے باوجود پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئی تھیں۔

"کس مقصد کیلئے؟"

"ہمیں گیارہ جنوری کو ایک پارٹی کو پیمنٹ کرنا تھی۔" وہ کمزور آواز میں بولا۔ نئے سوال نے اسے بڑی حد تک اعتماد سے محروم کر دیا تھا۔

"شعیب درانی صاحب! جو رقم کسی پارٹی کو دی جانے والی تھی وہ آپ کے اکاؤنٹ میں کیسے پہنچ گئی؟ میرا مطلب ہے' اگر رقم کو بینک میں جمع کرانا ہی مقصود تھا تو اسے یقیناً فیکٹری کے اکاؤنٹ میں جمع ہونا چاہئے تھا؟"

اب وہ بری طرح پریشان نظر آنے لگا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جج بڑی دلچسپ نظروں سے گواہ شعیب درانی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "شعیب درانی صاحب! میں آپ نے کچھ دیر قبل فاضل عدالت کو یہ بات بتائی تھی کہ وقوعہ کی رات ملک صاحب کے بنگلے سے واپسی کے دوران میں غریب آباد کے نزدیک چند پولیس والوں نے آپ کو گھیر لیا تھا اور آپ نے چار سو روپے

دے کر جان چھڑائی تھی۔ پولیس والے جب کسی کو گھیرتے ہیں تو ٹھیک ٹھاک طریقے سے اس کی تلاشی بھی لیتے ہیں۔ ایک لاکھ کی رقم ان کی تلاش سے کیسے بچ گئی؟"

وہ اچھا خاصا نروس ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں نے وہ رقم گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے چھپا دی تھی۔ آج کل شہر میں رہزنی کی وارداتیں بہت ہو رہی ہیں۔ میں نے حفاظت کے نقطہ نظر سے رقم اپنے پاس نہیں رکھی تھی اور میری بروقت احتیاط کام آگئی اور رقم ضائع ہونے سے بچ گئی۔"

میں نے اگلا سوال کیا۔ "ہاں واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ رقم ابھی تک آپ کے اکاؤنٹ میں محفوظ ہے۔"

اس نے امداد طلب نظروں سے بلقیس جہاں کی طرف دیکھا' بلقیس جہاں اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے دونوں کی مشکل آسان کرتے ہوئے جج کو مخاطب کیا۔ "جناب عالی! میں فاضل عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ملزم امیر بخش عرف میرو اور گواہ شعیب درانی کو حکم دے کہ وہ ایک کاغذ پر دستخط کر کے آپ کے حوالے کریں۔"

میری اس عجیب و غریب فرمائش پر وکیل استغاثہ چپ نہ رہ سکا۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں برہمی کا عنصر نمایاں تھا۔ "جناب عالی! یہ عدالت کا کمرا ہے نہ کہ کوئی تماشا گاہ۔ وکیل صفائی جانے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

"آپ کو کیا اعتراض ہے وکیل صاحب!" جج نے وکیل استغاثہ سے دریافت کیا۔

"مجھے اعتراض ہے جناب!" وکیل استغاثہ نے اعتراض برائے اعتراض کے طور پر کہا۔ "خواہ مخواہ فاضل عدالت کا وقت ضائع کیا جا رہا ہے۔"

"بیگ صاحب! آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟" جج نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "جناب عالی' میں ایک بہت بڑا انکشاف کرنا چاہتا ہوں میری درخواست ہے کہ میری یہ التجا قبول کی جائے۔"

جج نے میری فرمائش پوری کرنے کی اجازت دے دی۔ شعیب درانی اور میرو کو ایک ایک کاغذ اور قلم مہیا کیا گیا۔ پھر دونوں نے جج کی ہدایت کے مطابق اپنے اپنے حصے

کے کاغذ پر دستخط ثبت کر دیئے۔ دونوں کاغذ جج کو پیش کر دیئے گئے۔ شعیب درانی نے دائیں ہاتھ سے دستخط کئے تھے جبکہ میرو نے بائیں ہاتھ سے۔ جب میرو نے حوالات میں وکالت نامہ پر دستخط کئے تھے تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ لیفٹ ہینڈڈ ہے۔ جج نے دونوں کے دستخط ملاحظہ کرنے کے بعد نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ میری درخواست پر عمل کیا جا چکا تھا۔ میں نے گلا صاف کر کے کہا۔

"جناب عالی! آپ نے اپنی نظروں سے دیکھا ہے کہ ملزم میرو نے بائیں ہاتھ سے دستخط کئے ہیں جبکہ مقتول کے سینے پر خنجر اتارنے والا شخص دائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہو گئی کہ قتل میرو نے نہیں کیا۔"

وکیل استغاثہ بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ "جناب عالی! فاضل وکیل کو کیسے الہام ہوا کہ قاتل دائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے۔ عدالت کی نظر میں ایسی فرضی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ویسے فاضل وکیل کہانی گھڑنے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔" اس نے طنزیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب' آپ کیا کہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جناب عالی! میں نے کوئی فرضی بات نہیں کی بلکہ اپنے موقف کو عدالت میں ثابت بھی کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" وکیل استغاثہ نے حقارت سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنی فائل میں سے چند تصاویر نکال کر جج کو پیش کر دیں۔ میں نے وہ تصاویر اس اخبار کے دفتر سے حاصل کی تھیں جس نے ملک نواز علی کے قتل کی تفصیلی رپورٹ شائع کی تھی۔ وکیل استغاثہ ہونقوں کی مانند جج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جج نے بہ غور تصاویر کا جائزہ لینے کے بعد سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"جناب عالی! میں نے فاضل عدالت میں جو تصاویر پیش کی ہیں ان میں سے ایک تصویر میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ مقتول جس بیڈ پر لیٹا ہوا ہے وہ بیڈ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ تصویر میں مقتول بیڈ کی دیوار والی سائڈ پر چت لیٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یعنی مقتول کا بایاں پہلو دیوار کے انتہائی قریب ہے۔ خنجر کو مقتول کے سینے

میں عین دل کے مقام پر پیوست کیا گیا ہے۔ تصویر میں واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ بیڈ کا سرہانہ بھی ایک دیوار سے لگا ہوا ہے یعنی بیڈ' بیڈ روم کے ایک کونے میں سیٹ کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں بیڈ پر چڑھنے کیلئے بیڈ کی صرف سائیڈ ہی استعمال کی جا سکتی ہے یعنی یا تو پائنتی سے بیڈ پر چڑھا جا سکتا ہے یا پھر بیڈ کی وہ سائیڈ استعمال کی جا سکتی ہے جو دیوار کے ساتھ لگی ہوئی نہیں ہے۔ فاضل عدالت اس بات کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتی ہے کہ تصویر میں مقتول' جہاں اور جس پوزیشن میں لیٹا ہوا نظر آ رہا ہے' اس کے سینے میں خنجر اتارنے کیلئے قاتل کا دایاں ہاتھ استعمال ہونا ضروری ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے' جس کسی نے بھی مقتول نواز علی کے سینے میں خنجر اتارا ہے وہ دائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے اور۔۔۔"

"اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ قتل شعیب درانی نے کیا ہے؟" وکیل استغاثہ نے دخل در معقولات کرتے ہوئے نکتہ اٹھایا۔

"لیکن یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ قتل میرے موکل نے نہیں کیا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے استدعا کی۔ "جناب عالی! مجھے اپنی بات پوری کرنے دی جائے اور فاضل وکیل کو صبر و سکون کی تلقین کی جائے۔"

جج نے گھور کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔"

میں نے کہا۔ "جناب عالی' پولیس نے وقوعہ کا جو نقشہ تیار کیا ہے اس کی تفصیلات اس تصویر میں نظر آنے والی تفصیلات سے سو فیصد مطابقت رکھتی ہیں۔" جج نے چند ثانیوں تک پولیس کی رپورٹ کے مندرجات کا جائزہ لیا اور پھر اثبات میں سرہلاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "جناب عالی' اگر کسی شخص کے سینے میں خنجر اتارا جائے تو وہ آسانی سے جان نہیں دے دیتا کچھ دیر تڑپتا پھڑکتا رہتا ہے لیکن تصویر میں بستر کی حالت کوئی اور ہی کہانی سنا رہی ہے۔ وہاں کسی افراتفری کے آثار نظر نہیں آتے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مقتول نے کسی سے درخواست کی ہو کہ آؤ میرے سینے میں خنجر گھونپ دو۔ میں سی تک نہیں کروں گا اور چپ چپاتے جان دے دوں گا۔"

میں نے ایک لمحے رک کر حاضرین عدالت کا جائزہ لیا پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے

کہا۔ ”جناب عالی! ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب یا تو مقتول گہری نیند میں ہو یعنی بے ہوشی کی حد تک گہری نیند میں یا پھر وہ سرے سے زندہ ہی نہ ہو۔ کیمیائی تجزیے کی رپورٹ پہلی صورت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یعنی مقتول اس وقت عالم بے ہوشی میں تھا کیونکہ رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم میں ڈایا زی پام کی بھاری مقدار پائی گئی ہے۔ واضح رہے کہ مقتول بے خوابی کا شکار تھا اور ڈاکٹر نے مقتول کیلئے روش کمپنی کی تیار کردہ دوا ویلیم ٹو تجویز کی تھی۔ ویلیم تو دراصل دوا کا ٹریڈ نیم ہے جبکہ اس میں پائی جانے والی اصل مسکن دوا ڈایا زی پام کہلاتی ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب مقتول کے سینے میں خنجر اتارا گیا اس وقت وہ ڈایا زی پام کے زیر اثر تھا۔“

جج دلچسپی سے میرا بیان سن رہا تھا‘ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! یہ بات فاضل عدالت کے علم میں آ چکی ہے کہ وقوعہ کی رات مقتول سے ملنے والا آخری شخص شعیب درانی تھا۔ اس کی روانگی کے پانچ گھنٹے بعد ملک نواز علی کی موت واقع ہوئی ہے۔ اسی طرح مقتول کی بیوہ بلقیس جہاں جب دس جنوری کی صبح برکت کو ریسیو کرنے کیلئے ایئرپورٹ روانہ ہوئیں تو ان کی روانگی سے ڈیڑھ دو گھنٹے پیشتر ملک نواز علی اس دنیا کو خیرباد کہہ چکا تھا پھر گواہ شعیب درانی نے اپنی کار خراب ہونے اور پولیس والوں کے ہتھے چڑھ جانے کی جو کہانی سنائی ہے‘ وہ اس کی شخصیت کو مشکوک بناتی ہے۔ علاوہ ازیں مقتول کے دیئے ہوئے ایک لاکھ روپے جو کسی کاروباری پارٹی کو دیئے جانا تھے‘ ان کی گواہ کے اکاؤنٹ میں منتقلی کیا معنی رکھتی ہے۔ واضح رہے کہ مقتول کی بیوہ نے وقوعہ کی رات بیڈ روم میں موجود کپڑوں کی الماری میں سے ایک لاکھ روپے کی چوری کی بھی رپورٹ کی ہے جو شعیب درانی کے واضح اعتراف کے بعد غلط اور بدنیتی پر مبنی ثابت ہو جاتی ہے۔“

میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”جناب عالی‘ فنگر پرنٹس کی رپورٹ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ خنجر کے دستے پر پائے جانے والے نشانات ملزم میرو کی انگلیوں کے نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں میری فاضل عدالت سے استدعا ہے کہ وہ دونوں مشکوک افراد گواہ شعیب درانی اور مقتول کی بیوہ بلقیس جہاں کے فنگر پرنٹس لینے کی ہدایات جاری کرے تاکہ اس کیس کی کوئی واضح صورت سامنے آ سکے۔“ میں اپنی

بات مکمل کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

جج نے میری درخواست پر مذکورہ افراد کے فنگر پرنٹس لینے کے بارے میں متعلقہ حکام کیلئے ہدایات جاری کر دیں اور تفتیشی افسر پر یہ بات واضح کر دی کہ وہ گواہ شعیب درانی پر خصوصی نظر رکھے اور اس پر پابندی لگا دی جائے کہ وہ اپنے علاقے کے تھانے میں رپورٹ کئے بغیر کہیں جانے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے بعد جج نے نئی تاریخ دے کر سماعت ملتوی کر دی۔

میں جب عدالت کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچا تو میں نے دیکھا‘ تفتیشی افسر کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”شعیب درانی کا ذرا خاص خیال رکھنا۔ اگلی پیشی پر مجھے اپنے موکل کی ضمانت منظور کروانا ہے۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میرو کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

○

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرو کو ضمانت پر رہا کر دیا۔

برکت نے میرو کی شخصی ضمانت دی تھی جسے عدالت نے منظور کر لیا تھا۔ فنگر پرنٹس کی رپورٹ نے قاتل کو بے نقاب کر دیا تھا۔ خنجر کے دستے پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات شعیب درانی کی انگلیوں کے نشانات سے میچ کر گئے تھے۔ عدالت نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ وہ شعیب درانی کو گرفتار کر کے نیا چالان پیش کرے پھر حوالات کی مخصوص فضا میں پہنچ کر شعیب درانی ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ پولیس والے تو پتھروں کو بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شعیب درانی کس کھیت کی مولی تھا۔ چند گھنٹوں کی پھینٹی نے اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بلقیس جہاں نے حیرت انگیز طور پر طوطا چشمی کا مظاہرہ کیا تھا اور شعیب سے ملنے تک نہیں آئی تھی۔ ایک ہی رات میں پولیس نے شعیب درانی سے اقبال جرم کروا لیا تھا۔ اس نے پولیس کو جو بیان دیا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

بلقیس جہاں اور شعیب درانی میں دیرینہ آشنائی تھی۔ ملک نواز علی کے آفس میں

ملازمت دلوانے میں شعیب نے بلقیس جہاں سے بہت تعاون کیا تھا۔ ملک نواز علی خوب صورت عورتوں کا رسیا تھا مگر ابھی تک اس نے بلقیس جہاں کی طرف کوئی خاص پیش رفت نہیں کی تھی پھر ملک صاحب کو اپنی ایک پروڈکٹ کیلئے ماڈلنگ کی ضرورت پیش آ گئی اور اس نے ایک فیشن شو کا پروگرام بنایا۔ تمام انتظامات مکمل تھے مگر عین وقت پر پتہ چلا کہ ایک ماڈل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اب فوری طور پر کسی دوسری ماڈل کا انتظام کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ اگلے روز فیشن شو کا پروگرام تھا جو کہ ایک مقامی فور اسٹار ہوٹل میں ہونا طے پایا تھا۔ ملک نواز علی کی پریشانی کا حل مینجر شعیب درانی نے پیش کر دیا۔ شعیب درانی نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ بلقیس جہاں کو اس ماڈل کی جگہ پیش کیا جائے۔ ملک نواز نے جب اس تجویز پر غور کیا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ بلقیس جہاں کو ماڈلنگ کیلئے تیار کرنا شعیب درانی کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ پھر فیشن میں بلقیس جہاں نے وہ قیامت ڈھائی کہ ملک نواز علی کے ہوش اڑ گئے۔ اس نوعیت کا ہوش ربا حسن اس نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ کئی دنوں سے بلقیس جہاں کو اپنی غیر نصابی سرگرمیوں کا حصہ بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فیشن شو کے اختتام پذیر ہونے سے پہلے پہلے اس کی سوچ میں انقلابی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ بلقیس جہاں کا بے مثال حسن نواز علی کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر چکا تھا اور وہ اسے دل کی ملکہ بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا پھر بلقیس کو مسز نواز علی بننے میں دیر نہ لگی۔

شعیب درانی اپنے پلان کی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ چھ ماہ تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ بلقیس جہاں، شعیب کے اشاروں پر ناچتی رہی۔ یہ دونوں کا مشترکہ منصوبہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے مگر ان کی چاہت میں پوشیدہ لالچ کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ منفی سوچ کے مالک مجرمانہ ذہن رکھنے والے انسان تھے۔ بلقیس جہاں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ملک نواز علی کی حیثیت اس کے ہاتھوں میں ایک کھلونے سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اس دانا و بینا شخص کی عقل پر غارت گر ہوش، بلقیس جہاں نے پردے ڈال دیئے تھے۔ وہ جو حسین عورتوں کو ایک خوب صورت کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، اب بلقیس جہاں کی انگلی پکڑ کر چلنے کا محتاج تھا۔ بلقیس جہاں کی لحہ بہ لحہ رپورٹ شعیب درانی کیلئے باعث اطمینان تھی۔

پھر بلقیس جہاں نے اپنی پالیسی میں کچھ تبدیلی کی۔ اب وہ نہایت اہم باتیں شعیب درانی سے چھپانے لگی۔ اسی دوران میں بلقیس جہاں نے ملک نواز علی کو اس طرح شیشے میں اتارا کہ وہ اپنا سب کچھ اس کے نام کرنے کو تیار ہو گیا۔ ملک نواز علی نے اپنے وکیل سے مشورہ کیا۔ فیروز چغتائی نے اسے اس حماقت سے باز رہنے کی ہدایت کی اور یہ بھی یاد دلایا کہ اس کا ایک جوان بیٹا بھی ہے جو اس کی دولت و جائیداد پر پورا حق رکھتا ہے۔ ملک نواز علی یہ چاہتا تھا کہ وہ وکیل سے ایسی وصیت لکھوائے کہ اس کی موت کے بعد سب کچھ اس کی بیوی بلقیس جہاں کو مل جائے۔ وکیل نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس نوعیت کی وصیت کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ آپ اپنی زندگی میں اگر چاہیں تو اپنا سب کچھ کسی بھی شخص کو دے سکتے ہیں۔ اسے قانونی زبان میں ہبہ کرنا کہتے ہیں۔ اس کیلئے باقاعدہ ہبہ نامہ تحریر کیا جاتا ہے لیکن وصت میں آپ کسی شخص کو اپنی کل دولت و جائیداد کے ایک تہائی حصے سے زیادہ نہیں دے سکتے۔ فیروز چغتائی کی بات ملک نواز علی کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے کچھ اس انداز میں وصیت نامہ لکھوایا کہ اس کی موت کے بعد اس کی کل دولت و جائیداد کو تین برابر حصوں میں تقسیم کر کے بلقیس جہاں، برکت اور کینسر ریسرچ آرگنائزیشن کے حوالے کر دیا جائے۔ بلقیس جہاں کو یہ ساری باتیں معلوم تھیں مگر اس نے شعیب درانی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی اور ہر بار اسے "ابھی انتظار کرو" کا کہہ کر ٹال دیتی تھی۔ مجھے بہت سی باتیں وکیل فیروز چغتائی نے بتائی تھیں۔ اسی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ کسی نجومی نے ملک نواز علی کو خراب حالات کی پیش گوئی کر کے پریشان کر دیا تھا اور اپنی موت سے چند روز قبل ملک نواز علی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی وصیت کو تبدیل کر کے نیا وصیت نامہ تحریر کروانا چاہتا ہے۔ اسی سلسلے میں اس نے برکت کو بھی امریکہ سے بلوا لیا تھا۔ فیروز چغتائی نے مجھے ایک چونکا دینے والی بات یہ بتائی تھی کہ ملک نواز علی اپنی بیوی بلقیس جہاں کے کردار سے مشکوک ہو گیا تھا اور اس نے بلقیس جہاں کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ بات ملک نواز علی نے فیروز چغتائی کو اپنی موت سے چار روز پہلے بتائی تھی۔ ٹیلی فون پر گفتگو کرتے ہوئے وہ بہت پریشان تھا اور بڑے جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔ وہ فیروز چغتائی سے اتنی اہم بات اس لئے بھی کہہ گیا کہ ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت دوستانہ تھی۔

بلقیس جہاں ہر وقت اپنے میاں کی ٹوہ میں لگی رہتی تھی۔ اس روز اس نے ملک نواز علی اور وکیل کے درمیان ہونے والی گفتگو کا آخری حصہ چھپ کر سن لیا تھا۔ طلاق والی بات سن کر اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کی ساری محنت پر پانی پھرنے والا تھا۔ اگر ملک نواز علی اسے طلاق دے دیتا تو اس کا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔ وہ وصیت نامے کے مندرجات سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ اگر ملک نواز کی اچانک موت واقع ہو جاتی تو وہ اس کے کل اثاثوں کے ایک تہائی کی حق دار ٹھہرتی۔ بہ صورت دیگر وہ خالی ہاتھ وہاں سے نکال دی جاتی۔ حق مہر کی رقم اتنی معمولی تھی کہ۔۔۔ وہ اس سے آگے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کا پارا ساتویں آسمان کو چھونے لگا تو اس نے دل میں تہیہ کر لیا۔ ”ملک نواز کو جلد از جلد اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہئے۔“

حالات بھی پوری طرح اس کے حق میں سازگار تھے۔ پھر آٹھ جنوری کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اس کا کام مزید آسان ہو گیا۔ میرو کو جب بری طرح بے عزت کر کے بنگلے سے نکالا گیا تو بلقیس جہاں نے حتمی فیصلہ کرنے کے بعد شعیب درانی کو گرین سگنل دے دیا۔ شعیب درانی نے قتل ایسے جرم کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا مگر جب بلقیس جہاں نے صورت حال کی وضاحت کی اور اسے یقین دلایا کہ سارا الزام میرو پر آئے گا تو وہ اس کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہو گیا۔ میرو کا خنجر ابھی تک بلقیس جہاں کے پاس ہی تھا۔ اس نے اس خطرناک ہتھیار کو ضائع نہیں کیا تھا۔ میرو کی صورت میں اسے ایک پتلی گردن میسر آگئی تھی۔ اس لئے وہ اپنے منصوبے کی کامیابی کیلئے پر امید تھی۔ میرو ایک بار چوری کے الزام میں تھانے بھی جا چکا تھا اس لیے ایک لاکھ روپے کی چوری کا ڈرامہ بھی رچایا گیا تا کہ میرو کسی بھی طرح پھانسی کے پھندے سے بچنے نہ پائے۔ انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مگر اوپر والا بے نیاز ہے جسے وہ رکھے اسے کون چکھے۔ میرو خوش قسمت تھا کہ بچ گیا ورنہ آئے دن بہت سے بے گناہوں کو بھی پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔

وقوعہ کی رات شعیب درانی بظاہر بنگلے سے رخصت ہو گیا تھا مگر منصوبے کے مطابق وہ دوبارہ کچھ ہی دیر کے بعد بنگلے میں موجود تھا۔ ملک نواز علی کی اس رات طبیعت خاصی خراب تھی۔ جب تین بجے تک کسی بھی طرح نیند نہ آئی تو اس نے اپنی بیوی سے

نیند کی گولی مانگی حالانکہ وہ ایک گھنٹہ پیشتر ہی ویلیم ٹو کی ایک گولی کھا چکا تھا۔ بلقیس جہاں نے اسے پانچ گنا زیادہ طاقت والی ویلیم ٹین کی ایک اور گولی پانی کے ساتھ کھلا دی جس کا اس نے پہلے ہی انتظام کر رکھا تھا۔ ملک نواز علی کو غفلت کی نیند سلانے کیلئے یہ ایک کار آمد طریقہ تھا کیوں کہ ویلیم ٹو اور ویلیم ٹین کی گولیاں دیکھنے میں ایک ہی جیسی نظر آتی ہیں اور اس وقت تو ملک نواز علی کو اتنا ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ گولی کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا اور اگر بالفرض وہ نارمل بھی ہوتا تو گولی پوٹینسی چیک کرنے کی طرف اس کا دھیان نہیں جا سکتا تھا۔ گولی معدے میں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

اسی بے خبری کی کیفیت میں قریب قریب سوا چار بجے شعیب درانی نے اپنی ”رفیقہ کار“ کے ایما پر میرو کا خنجر ملک نواز علی کے سینے میں اتار دیا پھر وہاں سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے بلقیس جہاں نے ایک لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ بھی اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ پڑوسی چوکیدار تصدق حسین نے جس شخص کو چادر کی بکل مارے پر اسرار انداز میں ملک صاحب کے پچھواڑے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا' وہ یقینی طور پر شعیب درانی ہی تھا جس کی کار وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک محفوظ جگہ کھڑی تھی۔

شعیب درانی کے جانے کے بعد بلقیس جہاں نے خواب گاہ کی حالت ایسی بنا دی جیسے کوئی وہاں چوری کی نیت سے آیا ہو۔ اسی اٹھا پٹک کے دوران میں ملک نواز کی ایک ایسی ڈائری اس کے ہاتھ لگ گئی جس میں اس نے آج کی تاریخ میں برکت کی پاکستان آمد کے بارے میں تحریر کر رکھا تھا۔ فلائٹ کا نمبر اور وقت بھی لکھا ہوا تھا۔ بلقیس جہاں کے منصوبہ ساز ذہن نے فوری طور پر ایئرپورٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ملک صاحب کی خرابی طبیعت کی وجہ سے وہ خود برکت کو لینے آئی تھی۔ اس طرح اس کی جائے واردات سے غیر موجودگی بھی ثابت ہو جاتی اور اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ اس کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ ملک نواز علی نے برکت کو کیا ہدایت کر رکھی ہے۔ بہرحال وہ ایئرپورٹ پہنچ گئی پھر فلائٹ کی تاخیر اس کیلئے اور بھی مددگار ثابت ہوئی مگر برکت نے عدالت میں جو بیان دیا تھا اس نے میرے لیے حقیقت کی راہ کھول دی تھی۔

اگلی پیشی پر عدالت نے میرو کو باعزت طور پر بری کر دیا۔ پولیس نے نیا چالان پیش کر دیا تھا۔ جج نے شعیب درانی اور بلقیس جہاں پر فرد جرم عائد کر کے انہیں جیل بھیج دیا۔

اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود افراد میں سے دو کی حالت دیدنی تھی۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ رسولن بی بی کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں ایک چمک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اس کے جگر گوشے کو خدا نے نئی زندگی عطا کی تھی۔ دوسری جانب میرو یک ٹک بلقیس جہاں کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کیلئے وقت جیسے تھم کر رہ گیا تھا۔ اس کی نمناک آنکھوں میں اداسی کی دھند نے ڈیرا جما رکھا تھا۔ اس کے آنسو کوئی اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنا سب کچھ ہار کر جا رہا ہو۔

یہ آنسو بڑے بے زبان ہوتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا' خون جگر کس کیلئے آنکھوں سے بہہ گیا۔

○

خانہ برانداز

اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔

یعنی کوئی مرد ایک وقت میں چار بیویاں رکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ انصاف کے تقاضے پورے کر سکتا ہو۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں اور ضابطوں کے مطابق ہر نوعیت کے حقوق زوجیت بہ طریق احسن ادا کرنے کا اہل ہو۔ مگر ہمارے معاشرے میں دوسری شادی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ خصوصاً پڑھے لکھے طبقے میں تو اس کی پرزور مذمت بھی کی جاتی ہے۔

عائلی عدالتوں میں دوسری شادی کے بیسیوں مقدمات زیر سماعت رہتے ہیں۔ ایسے مقدمات کا اگر گہرائی میں مطالعہ کیا جائے تو کم و بیش نوے فیصد مقدمات میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ کہیں تو مرد ناانصافی کا مرتکب ٹھہرتا ہے اور کہیں عورت مرد کے حقوق واقعی کو تسلیم کرنے سے گریزاں نظر آتی ہے اور یہیں سب باہمی چپقلش اور رنجش کا آغاز ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرے کی عورت ایک جانب تو اپنے حقوق کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر شور مچاتی ہے اور دوسری طرف اپنے ہی جیسی کسی دوسری عورت کے حقوق کو صریحاً نظرانداز کرتے ہوئے ایک شادی شدہ مرد کی دوسری بیوی بننے کیلئے بھی تیار ہو جاتی ہے۔ گویا ایسی صورتحال میں وہ ایک عورت ہی کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہوتی ہے۔

بہرحال عائلی قوانین کی رو سے کوئی شخص اپنی پہلی بیوی کی اجازت لئے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کی دوسری شادی قانون کی نظر میں کالعدم تصور کی جاتی ہے اور ایسا شخص سزا کا مستوجب بھی ٹھہرتا ہے۔

اسی نوعیت کے ایک مقدمے کی روداد آج میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

اس روز عدالت میں میرا کوئی مقدمہ نہیں تھا اس لئے میں صبح سیدھا دفتر ہی گیا تھا۔ میرا دفتر صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ میں کوئی دس بجے دفتر پہنچا ہوں گا۔ انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر میں اپنے ذاتی کمرے میں آ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد میری سیکریٹری صبیحہ بانو نے رجسٹر میں اندراج کے مطابق پہلے ملاقاتی کو اندر بھیج دیا۔

وہ لگ بھگ پچپن سال کا ایک شریف صورت شخص تھا۔ بعد میں مجھے اس کا نام سعادت علی خان معلوم ہوا۔ سعادت علی خان نے شرعی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور وہ سفید براق کرتے پاجامے میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے کو بلاشبہ نورانی چہرہ کہا جا سکتا تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور خوش اخلاقی سے اسے بیٹھنے کو کہا۔

وہ بیٹھ گیا تو رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس کی آمد کی غرض و غایت معلوم کی۔ میں نے کہا۔ ”جی فرمایئے بزرگوار‘ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک وزٹنگ کارڈ برآمد کیا پھر اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”وکیل صاحب! ان صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر دیکھا۔ وہ ایک مقامی سماجی تنظیم کے منتظم اعلیٰ کا کارڈ تھا۔ میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے کارڈ کو اپنے سامنے میز پر رکھ دیا پھر سوالیہ نظروں سے سعادت علی خان کی جانب دیکھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر جیب میں سے ٹٹول کر ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے وہ کاغذ کھول کر پڑھا۔ وہ سماجی تنظیم کے منتظم اعلیٰ کی طرف سے میرے لیے تھا۔ جس میں درخواست کی گئی تھی کہ میں جہاں تک ممکن ہو‘ سعادت علی خان کی مدد کروں اور فیس کے معاملات میں بھی ذرا نرمی برتوں۔

میں نے پورا خط پڑھنے کے بعد سعادت علی خان سے دریافت کیا۔ ”آپ کس

سلسلے میں میری مدد چاہتے ہیں؟“

”وکیل صاحب! میں اپنی بیٹی کی وجہ سے پریشان ہوں۔“ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”فرمان صاحب نے مجھے یقین دلایا ہے کہ آپ ہمارے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔“

اتنا کہہ کر وہ امید افزا نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”سعادت علی خان صاحب! جب تک آپ مجھے پوری بات تفصیل سے نہیں بتائیں گے‘ میں آپ کیلئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ آپ اپنا مسئلہ کھل کر بیان کریں۔“

”میری بیٹی نگہت پروین کو اس کے شوہر نے گھر سے نکال دیا ہے۔“ سعادت علی خان نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ”اس بات کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”چھ ماہ۔“

”اب تک آپ کیا کر رہے تھے؟“ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ”کیا آپ نے اس واقعے کی رپورٹ تھانے میں درج کرا دی ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہم شریف لوگ ہیں وکیل صاحب! تھانے پولیس کی ہمت ہم میں نہیں ہے۔“

”آپ نے اپنے طور پر تو کوئی کوشش کی ہو گی۔ میرا مطلب ہے‘ آپ نے اپنے داماد سے پوچھ تاچھ تو کی ہو گی کہ اس نے اپنی بیوی کو کیوں گھر سے نکال باہر کیا؟“

”کوئی فائدہ نہیں ہے وکیل صاحب۔“ اس کے لہجے میں مایوسی کی جھلک نمایاں تھی۔ ”عبدالرؤف کے اندر کوئی بدروح سمائی ہوئی ہے۔ ہم دو سال سے اسے برداشت کر رہے ہیں۔ اس نے تو نگہت کی ذاتی رقم سے خریدا ہوا گھر بھی فروخت کر دیا ہے۔ میری بیٹی بے گھر ہو گئی ہے۔“

”کیا وہ گھر نگہت کے نام نہیں تھا؟“

”یہی تو اس سے غلطی ہوئی ہے جناب!“ سعادت علی خان نے بتایا۔ ”رقم نگہت کی خرچ ہوئی اور مکان رؤف نے اپنے نام سے خریدا۔ میری بچی بڑی بھولی ہے وکیل

صاحب!"

"آپ نے بتایا تھا کہ وہ رقم جس سے عبدالرؤف نے اپنے نام سے گھر خریدا تھا
نگہت پروین کی ذاتی رقم تھی۔" میں نے کہا۔ "آپ اپنی بات کی وضاحت کریں گے؟"

وہ میرے سوال کا مقصد سمجھ گیا' بولا۔ "شادی کے وقت عبدالرؤف کی خواہش
کے مطابق ہم نے جہیز کے سامان کی رقم نقد ادا کر دی تھی۔ رؤف کا خیال تھا کہ اس کے
گھر میں جب ہر چیز موجود ہے تو پھر خواہ مخواہ کی خریداری کر کے رقم کیوں ضائع کی
جائے۔ اس لئے ہم جو کچھ بھی جہیز کی صورت میں دینا چاہتے ہیں وہ رقم کی شکل میں دے
دیں۔ ہمیں اس کی تجویز مناسب لگی۔ سوچا' نقد رقم نگہت ہی کے کسی کام آجائے گی اس
لئے پچاس ہزار روپے جہیز کی مد میں ہم نے عبدالرؤف کو دے دیئے۔ بیٹی کو خالی ہاتھ گھر
سے رخصت کرنا بھی مناسب نہیں تھا اس لئے چند جوڑے کپڑوں کے اور پندرہ ہزار
روپے کے طلائی زیورات بنوا کر دیئے تھے۔"

وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے کہا۔ "پچاس ہزار کی رقم سے مکان خریدنا ممکن
نظر نہیں آتا۔ کیا عبدالرؤف نے اپنی طرف سے بھی کچھ رقم اس میں ملائی تھی؟"

"نہیں جناب' اس خبیث نے پھوٹی کوڑی بھی خرچ نہیں کی۔" سعادت علی خان
تیز لہجے میں بولا۔ "میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے غصے کو دبانے کی کوشش
رہا تھا۔ اس نے بتایا۔ "شادی کے موقع پر کسی رشتے دار نے سلامی میں نگہت کو سو رو…
والا انعامی بانڈ دے دیا تھا جو اس کی خوش قسمتی سے شادی کے چند ماہ بعد لگ گیا۔ ا…
انعام کی رقم ایک لاکھ روپے ملی تھی۔ نگہت نے رؤف کی باتوں میں آکر یہ رقم بھی ا…
کے حوالے کر دی۔ پچاس ہزار اس کے پاس پہلے سے موجود تھے۔ اس نے ڈیڑھ لاکھ…
تین کمروں کا ایک فلیٹ اپنے نام سے خرید لیا۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کے داماد عبدالرؤف نے فلیٹ کب فروخت کیا ہے؟"

"ہمیں یہ بات چند روز پہلے ہی معلوم ہوئی ہے۔"

یہ خاصی الجھی ہوئی صورتحال تھی۔ میں نے سوال کیا۔ "سعادت علی خا…
صاحب! نگہت کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"ایک [illegible] پورے ڈھائی سال ہو جائیں گے۔"

"نگہت کے کتنے بچے ہیں؟" میں نے استفسار کیا۔

"اللہ کا شکر ہے' ابھی اس کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔" اس کے لہجے کی چبھن
نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ ایک دکھی باپ کے دل سے اٹھنے والی آہ تھی۔
"ورنہ --- پتہ نہیں' اس معصوم پر کیا گزرتی پوری زندگی۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"انصاف۔" اس نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

"میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے' کورٹ میں
جائے بغیر ہی آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"ایسا ہو جائے تو پھر کیا چاہئے۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب۔"

میں نے کہا۔ "مگر اس کیلئے مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔"

"ہم ہر قسم کے تعاون کیلئے تیار ہیں۔"

"شادی کے موقع پر آپ نے نگہت پروین کیلئے جو طلائی زیورات بنوائے تھے کیا وہ
نگہت کے پاس ہی ہیں؟"

اس نے بتایا کہ عبدالرؤف نے نگہت کو گھر سے نکالتے وقت مذکورہ زیورات اپنے
ہی پاس رکھ لئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "آپ کے پاس ان زیورات کی خریداری کی
رسیدیں تو ہوں گی؟"

چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے۔
شاید گھر میں کہیں رکھی ہوں اور تلاش کرنے سے مل جائیں۔"

میں نے پوچھا۔ "اور جو پچاس ہزار روپے آپ نے بطور جہیز عبدالرؤف کو دیئے
تھے ان کا کوئی ثبوت آپ کے پاس؟"

"ہمیں کیا پتہ تھا کہ وہ بدبخت ایسا نکلے گا۔" سعادت علی خان نے ناگوار لہجے میں
کہا۔ "ورنہ ہم اسٹامپ پیپر پر اس سے لکھوا لیتے۔" پھر وہ بے بسی سے میری جانب دیکھتے
ہوئے بولا۔ "ہمارے پاس اس رقم کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

میں نے سوچا' پرائز بانڈ کا بھی کوئی واضح ثبوت ہو ہی نہیں سکتا۔ جس کے ہاتھ میں
بانڈ' رقم اس کی۔ سعادت علی خان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کا داماد

عبدالرؤف خاصا ہوشیار اور چالاک شخص تھا اور ان لوگوں کی سادگی و شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس سے نمٹنے کیلئے مجھے بھی ذرا مختلف انداز سے پیش رفت کرنا تھی۔

میں نے کہا۔ ”آپ کل تین بجے نگہت پروین کو ساتھ لے کر آ جائیں اور ہاں‘ ان کا نکاح نامہ بھی لیتے آئیں اور اگر زیورات کی رسیدیں بھی مل جائیں تو وہ بھی لے آئیں۔“

دو چار رسمی باتوں کے بعد اس نے میرا شکریہ ادا کیا پھر وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں اپنے دفتری معمولات میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے روز وہ مقررہ وقت پر میرے دفتر میں موجود تھا۔ نگہت پروین بھی اس کے ساتھ تھی۔ نگہت کی عمر کا میں صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا تھا کیوں کہ وہ سرتاپا ملبوس تھی۔ صرف دیکھنے کیلئے چہرے پر آنکھیں کھلی چھوڑ دی گئی تھیں۔ بعد میں نکاح نامہ دیکھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ اس کی عمر انتیس سال تھی۔

میں نے ضروری کاغذات کل ہی تیار کر لئے تھے۔ کچھ دیر کی رسمی گفتگو کے بعد میں نے وہ کاغذات نگہت کی طرف بڑھا دیئے پھر کاغذات کے نشان زدہ حصوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں دستخط کر دیجئے۔“

نگہت نے پریشان نظروں سے پہلے مجھے پھر اپنے باپ سعادت علی خان کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں تذبذب کے سائے لہراتے ہوئے واضح طور پر نظر آئے تھے۔

سعادت علی خان نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”وکیل صاحب! نگہت اسکول کی تعلیم سے نابلد ہے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو اسکول کالج نہیں بھیجا جاتا۔ بس گھر ہی میں قرآن کریم پڑھایا جاتا ہے۔ دنیاوی تعلیم کے ہم سخت خلاف ہیں۔ نگہت دستخط نہیں کر سکے گی۔ آپ اس کا انگوٹھا لگوا لیں۔“

مجھے اس کی جہالت پر غصہ تو بہت آیا تاہم میں نے قدرے نرمی سے کہا۔ ”محترم‘ تعلیم کوئی بھی بری نہیں ہوتی۔ چاہے وہ دینی ہو یا دنیاوی۔ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک نہیں سنا کہ علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے۔“

”دنیاوی تعلیم انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔“ سعادت علی خان باقاعدہ

تقریر کرنے والے انداز میں گویا ہوا۔

میں اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں تھا۔ کسی کے ذاتی نظریات میں دخل دینے کا میں قائل نہیں ہوں البتہ میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ اگر مولانا سعادت علی خان نے اپنی بیٹی نگہت کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم سے بھی روشناس ہونے کا موقع دیا ہوتا تو آج اسے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

میں نے اس کیس کے ضروری کاغذات پر نگہت کے انگوٹھے لگوائے پھر وکالت نامہ بھرنے کے بعد اس‘ پر بھی انگوٹھے کا نشان لیا۔ اس کے بعد نکاح نامے اور شناختی کارڈ کی نقول بھی حاصل کر لیں۔ سعادت علی زیورات کی رسیدیں بھی لے آیا تھا۔

کچھ دیر تک ہمارے درمیان ضروری گفتگو جاری رہی پھر میں نے انہیں پندرہ روز بعد آنے کا کہہ کر وہاں سے رخصت کر دیا۔ میں نے ان سے اپنی جائز فیس بھی وصول کر لی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ انشاء اللہ ان کا کام خاطر خواہ ہو جائے گا۔

سعادت علی خان کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ نگہت کا شوہر عبدالرؤف ایک اسٹیٹ ایجنسی چلاتا تھا۔ میں نے اس کی ایجنسی کا پتہ اپنے پاس نوٹ کر لیا تھا تاہم یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آج کل اس کی رہائش کہاں تھی۔ اسٹیٹ ایجنسی ناظم آباد میں تھی اور جو فلیٹ اس نے بیچ کھایا تھا وہ بھی ناظم آباد ہی میں تھا۔

اگلے دن میں نے عبدالرؤف کے نام ایک رجسٹرڈ نوٹس اسٹیٹ ایجنسی کے ایڈریس پر بھجوا دیا۔ نوٹس کا مضمون انگریزی میں کچھ یوں تھا۔

میری موکلہ مسمات نگہت پروین تمہاری قانونی اور شرعی بیوی ہے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی ذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے لیکن میری موکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ چھ ماہ پیشتر تم نے اسے بری طرح زدوکوب کرنے کے بعد دھکے دے کر نکال دیا تھا اور آج تک پلٹ کر اس کی جانب نہیں دیکھا۔ اس عرصے کے دوران میں تم نے نہ تو اسے نان و نفقہ دیا ہے اور نہ ہی حقوق زوجیت ادا کئے ہیں۔ علاوہ ازیں‘ تم نے اسے گھر سے نکالتے وقت اس کے طلائی زیورات جن کی مالیت دو سال قبل مبلغ پندرہ ہزار روپے بنتی تھی‘ بھی چھین لئے تھے۔

”میری موکلہ نے دعویٰ کیا ہے کہ تم نے اس کی ذاتی رقم مبلغ ڈیڑھ لاکھ روپے

(جہیز کی مد میں ادا کی گئی رقم پچاس ہزار روپے اور انعامی بانڈ کی رقم ایک لاکھ روپے۔ کل ملا کر ڈیڑھ لاکھ روپے) سے خریدے گئے فلیٹ کو بھی خورد برد کیا ہے۔ تمہارا یہ فعل قانونی اور اخلاقی اعتبار سے قابل مذمت ہے لہٰذا تمہیں اس نوٹس کے ذریعے اطلاع دی جاتی ہے کہ عرصہ دس یوم کے اندر اندر اپنی منکوحہ نگہت پروین کو آ کر لے جاؤ اور انسانوں کی طرح اسے اپنے گھر میں رکھتے ہوئے تمام حقوق ادا کرو۔ بصورت دیگر تمہارے خلاف سخت قسم کی قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ نوٹ: اگر تم نے معینہ مدت میں کوئی مثبت ردعمل ظاہر نہ کیا تو بذریعہ عدالت تمہیں مندرجہ بالا رقم اور زیورات کے علاوہ مزید واجبات ادا کرنا پڑیں گے جن میں سرفہرست نان و نفقہ بحساب بارہ سو روپے ماہوار جو کہ بہ وقت نکاح تحریری صورت میں درج کیا گیا۔ نکاح نامہ کالم نمبر بیس مسلم عائلی قوانین آرڈیننس مجریہ انیس سو اکسٹھ کے تحت چھ ماہ کی رقم ہو گی۔ عدالتی ہرجہ و خرچہ اس کے علاوہ ہو گا۔"

نوٹس میں اور بھی بہت سی قانونی باتیں درج تھیں۔ قارئین کو یقیناً اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی اس لئے ان کا تذکرہ ضروری نہیں ہے۔

اس کیس کی مزید تفصیلات میں جانے سے پیشتر ضروری ہے کہ ان حالات کا ذکر کیا جائے جن کے پیش نظر نگہت پروین اور عبدالرؤف کی شادی وقوع پذیر ہوئی تاکہ واقعات میں تسلسل قائم رہے اور قاری کا ذہن الجھن کا شکار نہ ہونے پائے۔ نگہت کے والد سعادت علی خان اور بعد میں دیگر لوگوں سے مجھے جو حقائق معلوم ہوئے، میں اس کا مختصر خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

○

نگہت نے ایک کٹر قسم کے مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ صوم و صلواۃ کی پابندی اور پردے پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اس خاندان میں۔ خاندانی روایت کے مطابق لڑکیوں کو صرف قرآنی تعلیم ہی سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ اسکول و کالج بھیجنے کا رواج نہ تھا۔ نگہت اور اس کے بعد آنے والی بہنیں اسکول کی تعلیم سے محروم ہی رہیں۔ انگوٹھا چھاپ ہونا ان کا مقدر ٹھہرا تھا۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے، اب بھی کراچی جیسے

ترقی یافتہ شہر میں ایسے گھرانے موجود ہیں جہاں لڑکیوں کی دنیاوی تعلیم کو گناہ کبیرہ تصور کیا جاتا ہے۔

نگہت سب سے بڑی تھی۔ اس کے بعد پانچ بہنیں اور تھیں۔ فوزیہ، یاسمین، فرزانہ جبیں، دردانہ شاہین، عفت نورین اور عمرانہ۔ شادی کے وقت نگہت ستائیس سال کی تھی۔ اس وقت دوسری بہنیں علی الترتیب چوبیس سال، بیس سال، اٹھارہ سال، سولہ سال اور تیرہ سال کی تھیں۔

نگہت نے اٹھارہویں سال میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے لئے رشتے کی تلاش شروع ہو گئی تھی مگر قسمت نے نو سال بعد یاوری کی۔ نگہت سے چھوٹی بہنیں بہت تیزی سے ایک کے بعد ایک سن بلوغت کو پہنچ رہی تھیں۔ والدین کو ان کی فکر کھائے چلی جا رہی تھی مگر کوئی رشتہ تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

پھر نگہت کیلئے عبدالرؤف کا رشتہ آیا تو گویا اس کی والدہ نے سکھ کی سانس لی۔ اب وہ اس حد تک سوچ رہی تھی کہ جو ہے، جیسا ہے، جہاں ہے کی بنیاد پر نگہت کا بوجھ اب سر سے اتار دیا جائے۔ اس لئے عبدالرؤف کے بارے میں زیادہ چھان بین کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی۔ عبدالرؤف کا رشتہ رشتے کرانے والی ایک عورت کے ذریعے آیا تھا۔

ایک ماہ کے اندر اندر رخصتی ہو گئی۔

وہ حجلہ عروسی میں بیٹھی آنے والے کا انتظار کر رہی تھی۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ وہ کسی کے انتظار سے رک تھوڑی جاتا ہے۔ نگہت کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے اس کی زندگی میں یہ لمحات آئے تھے ورنہ وہ تو مایوسی کی آخری حدوں کو چھو آئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی ایسا ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور کان کسی کے قدموں کی چاپ پر لگے ہوئے تھے۔ سہاگ کی سیج پر عورت اپنی زندگی کے عجیب، ترین انتظار سے گزرتی ہے۔ نشاط انگیز، لذت آمیز انتظار۔۔۔ نامعلوم خوف میں لپٹا ہوا، دل کے تاروں کو چھیڑتا ہوا انتظار۔۔۔ دل کی دھڑکنوں کو قدموں کی چاپ میں مدغم کرنے کا خواہاں انتظار۔

خوشبو کے ایک معطر جھونکے کو اپنے آس پاس محسوس کر کے اس نے آنکھیں

کھول دیں۔ اس کی سیج پر دلکشی کا گل زار مہک رہا تھا۔ وہ اپنی تصویر سے زیادہ وجیہہ اور خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگا اور اس کا دل فخریہ جذبات سے لب ریز ہو گیا۔ وہ خود کو ہواؤں میں محو پرواز تصور کرنے لگی۔

اسی خواب آگیں ماحول میں اس کی مدھر سرگوشی ابھری۔ "میری تنہائی کا سبب جانتی ہو؟"

نگہت اس وقت کچھ جاننا نہیں چاہتی تھی اس لئے انجان بنی رہی۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ "مجھے اپنی تنہائی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں اس لئے اکیلا رہتا ہوں کہ کوئی مجھے روکنے ٹوکنے والا نہ ہو حالانکہ میرے والدین اسی شہر میں ہیں مگر میں ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ بات آج ہی سے پلے باندھ لو کہ روک ٹوک سے مجھے ازلی چڑ بلکہ نفرت ہے۔"

نگہت کے خوابوں کا محل چکنا چور ہو گیا اور کرچیاں اس کی روح کو گھائل کرنے لگیں۔ وہ عبدالرؤف کو اپنا مجازی خدا مان کر اس کی عبادت کیلئے آئی تھی اس لئے زبان سے کچھ نہیں بولی حالانکہ اگر وہ چاہتی تو اس عجیب و غریب نصیحت پر احتجاجاً بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ عبدالرؤف کے جملہ حقوق اس کے نام محفوظ ہو چکے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھا اور ایک الماری سے شراب کی بوتل نکال لایا پھر نگہت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لو، میرے لئے جام تیار کرو۔"

"جی!" نگہت کے منہ سے بس ایک لفظ خارج ہوا پھر جیسے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ یک ٹک عبدالرؤف کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔

جس ماحول میں نگہت نے پرورش پائی تھی وہاں شراب کا تصور دنیا کی غلط ترین شے کا تھا چہ جائے کہ اس کا شوہر اسی کے ہاتھوں اپنے لئے جام بنانے کی فرمائش کر رہا تھا۔

نگہت کا سکتہ روز محشر تک طویل ہو جاتا کہ اس سجیلی خواب گاہ میں ایک مکروہ آواز نے زلزلہ پیدا کر دیا۔ عبدالرؤف کا بایاں ہاتھ بڑی سرعت کے ساتھ ہوا میں لہرایا اور ایک زناٹے دار تھپڑ نگہت کے دائیں گال کو گل نار کر گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے گلاب ہونٹوں کی سرخی کو منہ کے اندر سے رس آنے والے تازہ لہو کی آمیزش نے سرخ

تر بنا دیا۔

"سور کی بچی میں نے جو کہا ہے، ویسا ہی کرو۔" عبدالرؤف نے اسے ایک دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔ جی، کیا، کیوں اور کیسے جیسے الفاظ کبھی منہ سے نہ نکالنا۔"

اس انداز تکلم سے نگہت کے کانوں کی شناسائی آج پہلی مرتبہ ہو رہی تھی۔ اس کے باپ کو سور جیسے نجس جانور سے موسوم کیا گیا تھا۔

مگر وہ بے بس تھی، مجبور تھی جوابی کارروائی کے طور پر کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ بھی مقابلے پر اتر آتی تو جھگڑا اتنا بڑھتا کہ اس کا گھر جا بیٹھنا یقینی ہو جاتا اور وہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اس کے پیچھے پانچ بہنوں کی ایک طویل قطار تھی۔ اگر اس کا گھر اجڑ جاتا تو ان پانچوں کا مستقبل بھی داؤ پر لگ جاتا۔ لڑائی کو بڑھانا نگہت کیلئے کوئی ناممکن کام نہیں تھا۔

لڑائی تو دودھ کی لسی کے مانند ہوتی ہے جتنا پانی ڈالتے جاؤ، بڑھتی جاتی ہے۔ اس رات نگہت نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بہنوں کی خوشگوار زندگی کی خاطر خود کو قربان کر دے گی۔ ایک شخص کی قربانی سے اگر پورا گھر سنور جاتا ہو تو اس کام سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

نگہت نے خود کو اپنے مجازی خدا کے رنگ میں رنگ لیا۔ سعادت علی خان نے اپنا پورا جی پی فنڈ (جنرل پراویڈنٹ فنڈ) جہنم میں جھونک کر اس کیلئے جنت کی خوشیاں خریدنے کی کوشش کی، کچھ تو بوڑھے باپ کی لاج بھی اس پر لازم تھی۔

اس نے گھر والوں کو کچھ نہ بتایا خود زہر کے گھونٹ پیتی رہی اور اپنے ہاتھوں سے ہر رات عبدالرؤف کو شراب پلاتی رہی۔ پھر مجازی خدا نے راتوں کو دیر سے گھر آنا شروع کر دیا۔ ایک رات وہ تقریباً تین بجے لوٹا۔ نگہت اس کے انتظار میں آنکھیں جلا رہی تھی۔ آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ پوچھ بیٹھی۔

"کہاں رہ گئے تھے آپ؟ میرا دل ڈوب رہا تھا۔"

وہ نشے میں تھا، مخمور لہجے میں بولا۔ "اپنے دل کو سنبھال کر رکھو نگہت بی بی۔ کہیں تمہیں بھی نہ لے ڈوبے۔"

"میں آپ کیلئے پریشان ہو جاتی ہوں۔"

"مت ہوا کرو پریشان میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ کہیں کھو جاؤں۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "پھر بھی' مجھے آپ کی طرف سے فکر تو رہتی ہی ہے۔"

"فکر کی بچی۔" اس نے غصے میں ایک طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا شوہر ہوں' کوئی زر خرید غلام نہیں ہوں۔" پھر وہ جوتوں سمیت بستر پر گرتے ہوئے بولا۔ "میں آزاد پنچھی ہوں جہاں دل چاہے گا' جاؤں گا۔ جب دل چاہے گا' واپس آؤں گا۔"

نگہت خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

نگہت نے تو ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا لی تھی مگر جانے کیسے یہ بات سعادت علی خان تک پہنچ گئی۔ نگہت میکے آئی تو اس سے صبر نہ ہو سکا' بیٹی کو علیحدگی میں لے جا کر پوچھنے لگا۔

"میں نے سنا ہے رؤف شراب پیتا ہے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' آپ کو کس نے بتایا ہے؟" اس کے لہجے کا کھوکھلا پن واضح تھا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو بھلا مجھے معلوم نہ ہوتی۔"

"تم خواہ مخواہ اپنے میاں کی حمایت کر رہی ہو۔" سعادت علی خان نے ذرا سخت مگر سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "برائی کو یا تو ابتدا میں روکا جاتا ہے یا پھر کبھی نہیں روکا جا سکتا۔ ہر مکروہ فعل کی مذمت کرنا انسان پر لازم ہے بیٹی! وہ تمہارا شوہر ہے تم کوشش کرو گی تو وہ اس بری لت سے باز آ جائے گا۔"

وہ خاموش رہی۔ بول کر وہ رؤف کے "کارناموں" کا اقرار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ایک سال گزر گیا۔ پھر ڈیڑھ سال گزرا۔ چھوٹے موٹے جھگڑوں اور مار پیٹ کی اطلاعات تو گھر تک پہنچتی رہی تھیں مگر نگہت نے ہر بات کی پرزور تردید کر کے سب کا منہ بند کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ایک ہفتے کیلئے رہنے آئی۔ چار دن بعد ہی اسے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ وہ عبدالرؤف کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے یہ بات میکے میں نہیں بتائی تھی کہ دراصل رؤف ہی کے اصرار پر وہ رہنے آئی تھی اور اس نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ جب تک وہ خود لینے نہ آئے' نگہت میکے ہی میں رہے۔ چار روز بعد ہی وہ جب وہ واپس

چلی آئی تو رؤف نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ جب تک خود لینے نہ آؤں' تم وہیں رہنا؟"

نگہت نے کہا۔ "مجھے آپ کی یاد آ رہی تھی۔ وہاں میرا دل نہیں لگا تو چلی آئی۔"

مگر رؤف کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ کسی زخمی درندے کے مانند برہمی سے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ نگہت خاموشی سے لباس تبدیل کرنے کیلئے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

یہ وہی گھر تھا جو نگہت کے پیسوں سے خریدا گیا تھا مگر آج اس گھر میں ایک قیامت اس کی منتظر تھی۔ اس نے بیڈ روم میں ابھی قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ اپنے عقب میں رؤف کی دہاڑ سنائی دی۔ "رک جاؤ' اندر قدم نہیں رکھنا۔"

اس نے پلٹ کر حیران نظروں سے اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ رؤف کی تنبیہہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

پھر سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ صورت حال واضح ہوئی تو جیسے اس پر ساتوں آسمان ایک ساتھ آن گرے۔ اس کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے اور کانوں میں تیز ہواؤں کی سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ بیڈ روم کے اندر سے ابھرنے والی آواز نے اس کی سماعت میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔

"کیا ہوا رؤف؟" وہ کسی عورت کی آواز تھی۔ "حلق پھاڑ کر کیوں چلا رہے ہو؟ کون آیا ہے؟"

پھر وہ خود بھی اندر سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اس کے جسم پر مختصر لباس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نشے میں تھی۔ نگہت کیلئے وہ عورت اجنبی تھی۔ اس سے پہلے نگہت نے اسے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

وہ عورت کچھ ہی دیر کے بعد وہاں سے رخصت ہو گئی۔

وہ رات بڑی قیامت خیز گزری۔ نگہت رات بھر روتی رہی تھی۔ اپنے شوہر کا یہ روپ اسے کسی بھی طور گوارا نہ تھا۔ نگہت کا خیال تھا کہ رؤف پیار سے اسے چپ کرائے گا اور اپنے کئے پر شرمندگی کا اظہار کرے گا مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی اور صبح ہو گئی۔

نگہت نے پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے اس کی روح کو کچوکے لگا رہے تھے۔ آج وہ اپنی ہی نظروں میں گر چکی تھی۔ وہ خود کو کسی نالی کے غلیظ کیڑے کے مانند حقیر محسوس کر رہی تھی۔ کاش' اس نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا۔ اس سے پہلے اس کی آنکھیں پھوٹ جاتیں۔ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔

عورت ہر ظلم' ہر جبر اور ہر دکھ تکلیف برداشت کر لیتی ہے مگر اپنے شوہر میں شراکت داری اسے کسی بھی قیمت پر قبول نہیں ہوتی۔

اپنے وجود کی بے وقعتی اور اپنی ذات کی توہین کا احساس ہوتے ہی اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ "نگہت! تم میں ایسی کیا کمی ہے جو تمہارا شوہر کسی دوسری عورت کی زلفوں میں پناہ ڈھونڈ رہا ہے؟؟"

ذہن کے ایک گوشے سے جواب آیا۔ "مجھ میں کوئی کمی نہیں' کمی میرے شوہر میں ہے۔ وہ قدم قدم پر دی جانے والی میری قربانیوں کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ وہ کم ظرف ہے' اپنی کم ظرفی کی تکمیل کیلئے ایک دوسرے کم ظرف کی طرف بڑھ رہا ہے۔"

"اب کیا ہو گا!" اس کے ذہن نے استفسار کیا۔

"کچھ نہیں ہو گا!" جواب دل نے دیا۔ "وہی ہو گا جو منظور خدا ہو گا۔ اگر رؤف میرا ہے تو وہ ذلیل و خوار ہو کر آخر کار میرے ہی پاس آئے گا۔۔ اور اگر وہ میرا نہیں ہے تو پھر اس کے جانے کا کیا غم!"

شاید ایک کم ظرف اور اعلیٰ ظرف میں یہی فرق ہوتا ہے۔

ناشتے کی میز پر وہ بالکل نارمل نظر آ رہا تھا جیسے گزشتہ روز کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے چہرے پر اس واقعے کا ملال تک نہ تھا۔ نگہت نے بھی وہ ناخوشگوار تذکرہ چھیڑنے سے پرہیز کیا اور چپ چاپ ناشتہ کرتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آئندہ ایسا نہ ہو۔

نگہت کا یہ خیال بھی غلط نکلا۔ انسان بہت خوش فہم ہے۔ نگہت بھی ایک انسان ہی تھی۔ اسے بھی خوش فہمی تھی کہ اس کا شوہر ایک دن صرف اور صرف اسی کا ہو کر رہ جائے گا۔ وہ اپنے رویئے سے اسے یکسر بدل کر رکھ دے گی۔ مگر یہ خوش فہمیاں بہت تڑپاتی ہیں۔

بازاری عورتوں کو گھر پر لانا اور دادعیش دینا رؤف کا معمول بن گیا تھا اور یہ سب کچھ اب نگہت کی موجودگی میں ہو رہا تھا۔ اس ماحول میں نگہت کا دم گھٹ رہا تھا' سانسیں سینے میں الجھ رہی تھیں اور وہ ٹپ ٹپ آنسو بہائے چلی جا رہی تھی۔

نگہت نے اپنی نظروں میں رؤف کو جو مقام دے رکھا تھا' رؤف نے اس مقام کی قدر نہیں کی تھی۔ وہ نگہت کا آسمان تھا مگر پرائی زمینوں کو جھک کر چھو رہا تھا۔ گویا اپنے مقام سے گر رہا تھا۔

بعض اوقات انسان کو اپنے مقام سے گرنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ فوم کے ملائم بستر کو چھوڑ کر زمین پر سونا اچھا لگتا ہے۔

ایک روز نگہت کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ اس کی زبان پر لگا ہوا قفل خود ہی کھٹ سے کھل گیا تھا۔

"رؤف' آپ یہ سب چھوڑ نہیں سکتے۔ کیا آپ کو گھن نہیں آتی؟؟"

"تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی؟" وہ سرخ سرخ آنکھیں دکھا کر بولا۔ "میں نے تمہیں پہلی ہی رات اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ روک ٹوک مجھے پسند نہیں ہے۔"

وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ "رؤف! اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

"تو مت کرو برداشت۔ کون منت کر رہا ہے؟" وہ بے رخی سے بولا۔ "مجھے اپنے کام میں دخل اندازی پسند نہیں ہے۔ تم میری بیوی ہو' بیوی ہی رہو۔ استانی بننے کی کوشش نہ کرو۔"

"میں نے آپ کی خاطر کیا کیا قربانیاں نہیں دیں۔ آپ تو۔۔"

"بس بس' زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "اونہہ' تم کون سی قربانیوں کا ذکر کر رہی ہو۔ میرا ایک کام تو تم سے ہوا نہیں۔"

نگہت لرز کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی رؤف کا اشارہ کس کام کی طرف تھا۔ رؤف نے اس سے فرمائش کی تھی کہ وہ اپنی چھوٹی بہن عفت نورین سے اس کی دوستی کرا دے۔ عفت تمام بہنوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ رؤف کے دل میں اس کے لئے نیک خیالات نہیں تھے مگر یہ بات نگہت نے گھر والوں سے چھپا رکھی تھی البتہ وہ خود ہی اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتی تھی کہ عفت' رؤف سے زیادہ بے تکلف نہ ہونے

پائے۔

اس روز ان دونوں کے درمیان خوب جھگڑا ہوا۔ نگہت کے صبر کا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے بھی خوب کھری کھری سنائیں۔ رؤف جواباً مار پیٹ پر اتر آیا اور اس نے نگہت کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا پھر زبردستی گھر سے نکال دیا۔

سعادت علی خان اور دیگر گھر والوں کو ان کے چھوٹے موٹے جھگڑوں کا ہی پتہ تھا۔ نگہت نے کبھی اپنے زخمی دل کی ایک جھلک بھی انہیں نہیں دکھائی تھی۔ وہ خواہ مخواہ اپنے پیاروں کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے چپ چاپ ہر ستم اپنے دل پر سہہ رہی تھی۔

اس مرتبہ وہ جس حالت میں گھر پہنچی تھی اس سے اس پر بیتنے والی قیامت کا پردہ چاک ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے نشان اس کی بے بسی کی کہانی سنانے کیلئے کافی تھے۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ میاں بیوی میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ کوئی اس کے دل کا حال نہیں جانتا تھا اور جانتا بھی کیسے۔ اس نے آج تک ان کی دل آزاری کے خیال سے کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔

نگہت کی ماں ملیحہ بیگم نے تو بیٹی کی حالت زار دیکھتے ہی سینہ کوبی شروع کر دی۔ "میری پھول سی بچی کا کیا حشر کر دیا۔ ہائے، کیا اندھیر مچا ہوا ہے میں ابھی اس خبیث کی گوشمالی کیلئے جاتی ہوں۔"

نگہت ماں کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ سعادت علی خان نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے میاں بیوی میں جھگڑا ہو ہی جاتا ہے۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔"

"پریشانی کی بات کیسے نہیں ہے۔" ملیحہ بیگم تڑ سے بولی۔ "وہ میری بچی کو جان سے مار دے گا تب آپ کو ہوش آئے گا۔ مجھے تو وہ پہلے ہی دن سے پسند نہیں تھا۔"

سعادت علی نے کہا۔ "نگہت کو اب میں یونہی جانے نہیں دوں گا۔ رؤف آئے گا تو میں خود اس سے بات کروں گا۔"

"مگر میں اس مردود کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتی۔" ملیحہ غضب ناک لہجے میں بولی۔ "میں ابھی جاؤں گی اور تحقیق کروں گی۔"

"تحقیق کا وقت اب گزر چکا ہے بیگم!" سعادت علی نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "یہ کام تمہیں اس وقت کرنا چاہئے تھا جب رؤف کا رشتہ آیا تھا مگر اس وقت تو میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ اب کیا فائدہ؟ تمہاری جلد بازی کا نتیجہ تو نگہت کو بھگتنا ہی پڑے گا۔"

"میں کیا کرتی؟ انہیں کسی ٹھکانے بھی تو لگانا تھا۔" ملیحہ بیگم نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "خدا خدا کر کے بڑی کا گھر بسا تھا۔ میں تو خوش تھی کہ چلو ایک کا نصیب کھلا ہے تو باقیوں کا بھی کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔"

سعادت علی نے تجویز پیش کی کہ "رشتہ کرانے والی عورت سے رابطہ کرنا چاہئے۔"

چنانچہ اس عورت کو ڈھونڈ کر گھر بلایا گیا۔ اس نے بڑی شرافت سے یہ بات قبول کر لی کہ اس نے رؤف کے بارے میں کئی جگہ پر غلط بیانی سے کام لیا تھا۔

اس نے بتایا۔ "مجھے رؤف صاحب نے حقیقت حال بتانے سے سختی سے منع کیا تھا اور تاکید کی تھی کہ میں لڑکی والوں کو یہی بتاؤں کہ اس کے والدین اسی شہر میں رہتے ہیں مگر وہ ان سے قطع تعلق کر چکا ہے۔"

"تم نے ہمیں بتایا تھا کہ رؤف کے گھر چھوڑنے کی وجہ اس کی سوتیلی ماں کا ناروا سلوک تھا۔" ملیحہ بیگم نے اسے اس کی بات یاد دلائی۔

"جی ہاں، رؤف نے مجھے یہی پٹی پڑھائی تھی۔"

سعادت علی خان نے پوچھا۔ "اور حقیقت کیا ہے؟"

اس نے حقیقت حال کھول کر بیان کر دی جس کا ذکر مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

نگہت گزشتہ چھ ماہ سے گھر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے والدین کا خیال تھا کہ رؤف ایک دن خود ان کے پاس آئے گا اور اپنے رویئے پر پشیمانی ظاہر کر کے نگہت کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ان کی امید اس وقت دم توڑ گئی جب انہیں پتہ چلا کہ عبدالرؤف نے ناظم آباد والا فلیٹ فروخت کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ دوڑے دوڑے میرے پاس آئے تھے۔

اس کیس کے بارے میں بہت سی معلومات مجھے بعد میں حاصل ہوئی تھیں۔

خصوصاً نگہت اور عبدالرؤف کی خانگی زندگی اور عبدالرؤف کی "غیرنصابی" سرگرمیو
سے متعلق تفصیلات مجھے خود نگہت نے فراہم کی تھیں۔ میں نے واقعات کے تسلسل
قائم رکھنے اور قارئین کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تفصیل بیان کر دی ہے۔

○

نوٹس کی ترسیل کے ایک ہفتے بعد ایک دراز قامت شکیل و جمیل شخص میرے
میں داخل ہوا۔

اس وقت پانچ بجنے میں دس منٹ باقی تھے اور ہم دفتر بند کرنے ہی والے تھے
میری سیکریٹری کا گھر میرے راستے میں پڑتا تھا۔ میں اسے ڈراپ کرتے ہوئے نکل جا
تھا۔ دفتر بند کرنے کی ذمے داری آفس بوائے سکندر علی کی تھی۔

آنے والا بڑے غصے میں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کے ہاتھ میں ایک لفا
دبا ہوا تھا۔ اس نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ لفافہ میرے سامنے میز پر پٹخ دیا

"یہ کارنامہ آپ نے انجام دیا ہے؟" وہ خونخوار لہجے میں دہاڑا۔

میں نے اس کے رویئے کی پرواہ کئے بغیر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبا
کیا۔ پھر خوشگوار لہجے میں' ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تشریف
رکھیں۔"

"میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے۔" وہ بدستور ناگواری سے بولا۔ "میں صر
یہ پوچھنے آیا ہوں کہ اس نوٹس کا مقصد کیا ہے؟" اس نے انگلی کی مدد سے میز پر پڑ
ہوئے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے پہلی ہی نظر میں لفافے کو پہچان لیا تھا۔ ایک ہفتہ قبل میں نے خودا
ہاتھوں سے عبدالرؤف کے نام پوسٹ کیا تھا۔

"غالباً آپ عبدالرؤف ہیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "نگہت پروین
شوہر۔"

"اس عورت کا نام نہ لیں میرے سامنے۔" اس نے ایسا منہ بنایا جیسے کسی بدذا
چیز کو نگل لیا ہو۔ "میں نے اس کی وجہ سے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کرسی

بیٹھ گیا۔

"اچھا!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مگر میری موکلہ نے تو
کوئی اور ہی کہانی سنائی ہے۔"

"اس نے میرے ظلم و ستم کی ایک طویل فہرست گنوائی ہو گی۔" اب وہ آہستہ
آہستہ کھلتا جا رہا تھا اور اس کے لہجے سے غصہ بھی غائب ہو گیا تھا۔ "اور یہ بھی کہا ہو گا
کہ میں بہت بدکردار ہوں۔ شرابی اور زانی ہوں۔ بازاری عورتوں سے میرے تعلقات
ہیں۔"

"کمال ہے!" میں نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کو یہ سب باتیں کیسے
معلوم ہوئیں۔ کیا آپ ٹیلی پیتھی جانتے ہیں؟"

"آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں وکیل صاحب۔" اسے دوبارہ غصہ آ گیا۔ "مجھے تو
حیرت ہو رہی ہے آپ عدالت میں مقدمات کس طرح لڑتے ہوں گے۔ میں نے سن رکھا
ہے وکیل حضرات بہت شاطر اور چالاک ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"وکیل صاحب! عورت کے چھل فریب کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کیلئے
بہت تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس شعبے میں ٹیلی پیتھی سے زیادہ تجربات کا عمل دخل
ہے۔ معلوم ہوتا ہے' آپ ابھی تک اللہ کی اس نعمت سے محروم ہیں۔"

میں نے ایک سرد آہ بھری پھر کہا۔ "تمہارا اندازہ درست ہے۔"

میں دانستہ اس سے بے تکلف ہو رہا تھا۔ اس طرح مجھے اس کی کمزوریاں جاننے کا
زیادہ سے زیادہ موقع ملتا جو مقدمے کی صورت میں میرے لئے خاصی مفید ثابت ہوتیں۔
میں نے پوچھا۔ "اس نوٹس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جھوٹ کا پلندا۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ "اس میں پیش کئے گئے تمام مطالبات
میں دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے۔"

"مطلب!" میں نے وضاحت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میرے سوال کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ "اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو سکتا
ہے کہ سعادت علی خان جیسے ٹٹ پونجیئے نے مجھے جہیز کیلئے پچاس ہزار روپے دیئے پھر

انعامی بانڈ والا قصہ بھی کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ وہ بانڈ میرے پاس پانچ سال سے رکھا ہوا تھا جس پر انعام نکلا تھا۔ نگہت والا بانڈ تو ابھی تک میرے پاس موجود ہے لیکن وہ لوگ میری بات کا یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ باقی رہی بات زیورات کی تو وہ نگہت جاتے وقت اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ میں تو اس وقت اسٹیٹ ایجنسی پر تھا۔"

اس کی آنکھوں میں مکاری اور چال بازی کے ملے جلے تاثرات چمک رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس سے نمٹنے کے لیے خصوصی پینترے استعمال کرنا پڑیں گے۔ اس نے جہیز اور انعامی بانڈ کی رقم کو ہڑپ کرنے کا بڑا مضبوط جواز تراش لیا تھا۔ اس سلسلے میں میری موکلہ کی پوزیشن خاصی کمزور تھی۔ نہ تو جہیز کی رقم کی ادائیگی کا کوئی گواہ موجود تھا اور نہ ہی یہ ثابت کیا جا سکتا تھا کہ نگہت والے بانڈ پر ہی انعام نکلا تھا۔ میں نے ایک اور رخ سے حملہ کیا۔ "میری موکلہ تو اپنے واجبات کے حصول کیلئے کورٹ تک جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ وہ تو میں نے اسے روک رکھا ہے ورنہ اب تک کیس عدالت میں لگ چکا ہوتا۔"

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

میں نے کہا۔ "مگر میں تمہارے خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔" پھر میں نے نکاح نامے کی نقل کو اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کالم نمبر بیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "اس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

مذکورہ کالم میں نان و نفقہ کے بارے میں تحریر کیا گیا تھا۔

"اسی لئے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں وکیل صاحب!" اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ "اس سلسلے میں، میں کچھ رقم خرچ کرنے کو تیار ہوں۔"

"بات کچھ رقم کی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تحریر کے مطابق چھ ماہ کا نان و نفقہ بحساب بارہ سو روپے ماہوار مبلغ سات ہزار دو سو روپے بنتا ہے۔ یہ تو تمہیں ہر صورت ادا کرنا ہو گا۔ علاوہ ازیں تم نے اس عرصے کے دوران میں حقوق زوجیت بھی پورے نہیں کیے۔"

"آپ بہت زیادہ رقم بتا رہے ہیں وکیل صاحب۔"

"بالکل سیدھا حساب ہے۔ اس میں الجھن کی کیا بات ہے؟"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا مگر پھر پرخیال لہجے میں بولا۔

"میں تین ہزار تک دینے کو تیار ہوں۔ خواہ مخواہ کورٹ کچہری کے جھمیلے میں پڑنے سے فائدہ۔"

میں نے بظاہر اس کے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ یہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے جسے گھر میں ہی نمٹا لینا چاہئے۔ کورٹ میں جانے کی نوبت نہیں آنا چاہئے۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے۔" اس کے چہرے پر مجھے پہلی مرتبہ خوشی جھلکتی دکھائی دی۔ وہ اپنی دانست میں مجھے اپنے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ آپ اسے راضی کر لیں میں آپ کے روبرو رقم ادا کروں گا۔"

میں نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "تین ہزار بہت کم ہیں وہ اتنی رقم میں راضی نہیں ہو گی۔ تم اس پر نظرثانی کرو۔"

میں دانستہ اسے ایسا تاثر دے رہا تھا جیسے میری ساری ہمدردیاں اسی کے ساتھ ہوں۔ میں نے اس کے اردگرد ایک نادیدہ جال پھیلا دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس جال میں الجھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "وکیل صاحب پانچ ہزار میں میری جان چھڑائیں۔۔ میں کل رقم لے آتا ہوں۔ آپ اپنی موکلہ کو بلوا لیں۔"

میں نے کہا۔ "رقم تو تم نے معقول بتائی ہے مگر تمہاری جان اتنی آسانی سے نہیں چھوٹے گی۔"

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

میں نے نکاح نامے کے کالم نمبر تیرہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری جان اس زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے۔ جان چھڑانے کیلئے تمہیں اس رقم میں مبلغ پینتیس ہزار روپے کا اضافہ کرنا ہو گا۔ یعنی اس صورت میں تمہیں چالیس ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے۔"

نکاح نامے کے مذکورہ کالم میں حق مہر کی رقم درج تھی۔

وہ بھڑک اٹھا۔ "وکیل صاحب! آپ بہت چالاک ہیں۔ آپ مجھے پھانسنے کی

کوشش کر رہے ہیں۔"

"خدانخواستہ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "میں نے تو تمہیں ایک مشورہ دیا۔۔۔ اور وہ بھی مفت۔۔۔"

وہ غصے سے بولا۔ "مجھے ایسے مشورے کی ضرورت نہیں ہے جو میرے لئے نقصان کا باعث ہو۔ آپ اپنی موکلہ کی وکالت کر رہے ہیں۔"

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں اپنی ذمے داری نبھا رہا ہوں۔" میں نے تیز آواز میں کہا پھر آواز دھیمی کر کے رازدارانہ لہجے میں اضافہ کیا۔ "میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے عبدالرؤف۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ گھر کی بات گھر ہی میں طے ہو جائے۔ میں ان وکیلوں میں سے نہیں ہوں جو محض اپنی فیس کھری کرنے کے لئے لوگوں کو عدالتوں میں خوار کرتے رہتے ہیں۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے دو روز کی مہلت دے دیں۔ مجھے سوچنے کا موقع چاہئے۔ میں دو روز بعد آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ جب تک کیس کو عدالت تک نہ لے جائیں۔ میری بس آپ سے یہی درخواست ہے۔"

وہ سانپ کی طرح کینچلی بدل رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ دو روز کی مہلت اس نے کسی خاص مقصد کے تحت حاصل کی تھی۔ وہ اتنا سیدھا نہیں تھا کہ تصفیے کی کوئی صورت نکالتا۔ بہرحال، میں نے بھی سوچا کہ چلو گھی اگر سیدھی انگلی سے نکل ہی رہا ہے تو انگلی ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس دوران میں، میں نگہت پروین سے بھی ایک میٹنگ کر لینا چاہتا تھا۔

میں نے عبدالرؤف کو دو دن بعد آنے کا کہہ کر رخصت کر دیا۔

○

سعادت علی خان کو میں نے پندرہ روز بعد بلایا تھا۔ جس میں سے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ دو روز بعد عبدالرؤف کو آنا تھا۔ میں اس سے پہلے نگہت سے مل لینا چاہتا تھا۔

سعادت علی کی رہائش پاک کالونی میں تھی مگر اس کے گھر میں ٹیلی فون نہیں تھا۔

اس لیے مجھے خود اس کے گھر جانا پڑا۔ سعادت علی ساٹھ گز کے ایک کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے کریانے کی ایک دکان کر لی تھی۔ ملازمت میں رہتے ہوئے بھی وہ سہ پہر کے بعد سے رات گئے تک پان سگریٹ کا ایک کیبن چلاتا تھا۔ جب کریانے کی دکان کا آغاز ہوا تو پان کا کیبن بھی اسی کا حصہ بن گیا۔

میں نے عبدالرؤف سے ہونے والی ملاقات کی تفصیلات بتانے کے بعد سعادت سے پوچھا۔ "اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ نگہت اپنے گھر میں راضی خوشی رہنے لگے۔" سعادت علی نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔ اس وقت ہم گھر کے ڈرائنگ روم کہلانے والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ سعادت علی نے کہا۔ "ہمیں پیسے روپے کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ بس وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے اور نگہت کو انسانوں کی طرح گھر میں رکھے، ہمیں اور کچھ نہیں چاہئے۔"

نگہت بھی وہیں موجود تھیں۔ اس وقت اس نے خود کو سات پردوں میں نہیں چھپا رکھا تھا۔ وہ عام گھریلو لباس میں ملبوس تھی۔ میں نے دیکھا، وہ خوب صورت خدوخال کی مالک ایک سانولی سلونی عورت تھی۔ اس کے چہرے پر نمایاں چیز اس کی کنول کٹورا آنکھیں تھیں جن میں بلا کی کشش مجھے محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کیلئے مجھے عبدالرؤف کی قسمت پر رشک سا آیا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے خیالات کا دھارا سعادت علی خان کی طرف موڑ دیا۔

"آپ نے اپنی بیٹی سے مشورہ کر لیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

باپ کے بجائے بیٹی نے جواب دیا۔ "وکیل صاحب! میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔" وہ خاصی مضطرب دکھائی دیتی تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے سعادت علی کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ "ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ نگہت سے بات کر لیں۔ میں جب تک چائے بنوا تا ہوں۔"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے بلدی سے کہا۔ "میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

مگر اس وقت تک سعادت علی خان گھر کے اندرونی حصے کی جانب جا چکا تھا۔

اس مختصر سی نشست میں نگہت پروین نے نہایت موزوں اور موثر الفاظ میں گویا اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کوئی بغیر پڑھی لکھی لڑکی بول رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار اسے کوئی ہمدرد میسر آیا ہو۔ اس کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر عبدالرؤف کے ساتھ زندگی گزارنے کیلئے تیار نہیں تھی۔ وہ ہر حال میں چھٹکارا چاہتی تھی۔ اس نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے عبدالرؤف کی ایسی ایسی بد فعلیوں کا ذکر کیا تھا کہ میں بھی اس کا ہم خیال ہو گیا تھا۔

میں نے بہت محتاط لہجے میں کہا۔ "آپ کے والد تو آپ کا گھر بسا دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"وہ مجھ پر گزرنے والی قیامت سے نا آشنا ہیں۔" اس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے۔ "میں بھیک مانگ کر گزارہ کر لوں گی، اپنے والدین پر بوجھ نہیں بنوں گی مگر اس خبیث کا سایہ اپنے وجود پر نہیں پڑنے دوں گی۔ میرے دل کے ہر گوشے میں اس کیلئے نفرت ہی نفرت بھری ہوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس صورت میں تو مجھے آپ کی طرف سے خلع کی درخواست عدالت میں دائر کرنا پڑے گی۔"

"آپ کچھ بھی کریں۔ بس مجھے اس کی نحوست سے نجات دلا دیں۔"

"خلع کی صورت میں آپ کو حق مہر کی رقم چھوڑنا پڑے گی۔" میں نے ایک قانونی نکتہ اس کے گوش گزار کیا۔ "انعامی بانڈ کی رقم اور جہیز والے پچاس ہزار روپے ملنے کے امکانات بھی معدوم ہیں۔ زیورات بھی اس نے آپ کے کھاتے میں ڈال دیئے ہیں۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ اس طرح سراسر آپ کا مالی نقصان ہو گا۔"

ایک وکیل کی حیثیت سے یہ میرا فرض بنتا تھا کہ میں اپنے موکل کو قانونی باریکیوں سے آگاہ کروں۔

نگہت نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ "میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی دولت پر جس سے سکھ کی ایک سانس نہ خریدی جا سکے۔ میں سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں۔ آپ میری جانب سے کل ہی خلع کی درخواست دائر کر دیں۔"

اسی وقت سعادت علی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ملیحہ بیگم بھی چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر آ گئی۔ نگہت کو مجبوراً خاموش ہو جانا پڑا۔

چائے پینے کے دوران میں ہلکی پھلکی رسمی گفتگو ہوتی رہی پھر میں ان سے یہ وعدہ کر کے وہاں سے اٹھ آیا کہ ان کی ہر ممکن قانونی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔ دل میں، میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ نگہت کیلئے مجھ سے جو بھی ہو سکا، اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔

دوسرے روز میں نے دفتر آنے کے بعد عبدالرؤف کی اسٹیٹ ایجنسی پر فون کیا۔ وہ جاتے ہوئے مجھے اپنا وزٹنگ کارڈ دے گیا تھا۔ اس کو ایک روز بعد میرے پاس آنا تھا مگر میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس مسئلے کو حل کر دوں۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں نگہت کو عبدالرؤف سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ ایک معقول رقم بھی دلوا دوں۔ اسی لئے مجھے عبدالرؤف کو شیشے میں اتارنا تھا۔

میں بخوبی جانتا تھا کہ اگر عدالت میں خلع کا مقدمہ چلا تو نگہت کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔ اسے فریق ثانی کی شرائط پر اپنے بہت سے حقوق سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ میں کسی بھی صورت میں اپنی موکلہ کا نقصان نہیں چاہتا تھا۔

اس وقت سوا چار کا وقت تھا۔ تیسری گھنٹی پر دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا پھر کسی کی آواز آئی۔ "ہیلو! رؤف اسٹیٹ ایجنسی۔"

دوسری طرف سے بولنے والا عبدالرؤف نہیں تھا بلکہ وہ کسی نوجوان لڑکے کی آواز تھی۔ میں نے اپنا تعارف کرائے بغیر پوچھا۔ "عبدالرؤف صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟"

"وہ اس وقت اپنے گھر پر ہوتے ہیں۔"

میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ مجھے رؤف کی نئی رہائش گاہ کا علم نہیں تھا۔ میں نے ایک چال چلنے کا فیصلہ کیا۔

"مجھے ان کے گھر کا ایڈریس چاہئے بیٹا۔" میں نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اس نے بتایا۔ "وہ گلشن اقبال میں کہیں رہتے ہیں۔ گھر کا صحیح پتہ مجھے معلوم نہیں ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" میں نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ "ان کا فون نمبر تو تمہارے پاس ہو گا؟"

اس نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ کون ہیں؟"

میں نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔ "تم شاید اس ایجنسی پر نئے آئے ہو۔ میں عبدالرؤف کا ایک دوست غفار بھائی بات کر رہا ہوں۔ میرے پاس سے ان کا گھر کا ٹیلی فون نمبر کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہے اور اس وقت ان سے بات کرنا بھی ضروری ہے۔"

میرا تیر نشانے پر لگا۔ اس نے کہا۔ "مجھے اس ایجنسی پر کام کرتے ہوئے ابھی چار ماہ ہی ہوئے ہیں۔ سوری انکل' میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ سیٹھ سے میری شکایت نہ کیجئے گا۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا۔" میں نے اپنے لہجے میں پیار بھر کر کہا۔ "بعض اوقات ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

اس نے چاؤ سے مجھے گلشن اقبال کا ایک ٹیلی فون نمبر لکھوا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میری انگلیاں وہ نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔

بیل مسلسل جا رہی تھی مگر کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ میں نے فون بند کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا پھر میری کان میں خمار آلود نسوانی آواز آئی۔

"ہیلو!"

میرا چونک جانا ایک فطری بات تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اس نمبر پر کسی عورت سے ہم کلام ہونا پڑے گا۔ ایک لمحے کیلئے میرے ذہن میں آیا کہ شاید کوئی رانگ نمبر لگ گیا ہے پھر بھی میں نے اپنی تسلی کیلئے نمبر کی تصدیق کر لی۔ مذکورہ نمبر دہرانے کے بعد میں نے پوچھا۔ "عبدالرؤف صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟"

وہ جو کوئی بھی تھی' شاید گہری نیند سے جاگی تھی یا پھر وہ نشے میں تھی۔ اسی مخمور آواز میں پوچھا۔ "آپ کی تعریف۔"

"میں غفار بھائی بات کر رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "چند روز پیشتر کینیا سے آیا ہوں۔ عبدالرؤف میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ پورے تین سال کے بعد وطن

لوٹا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

"میں ان کی بیوی بات کر رہی ہوں۔"

میرے ذہن میں جیسے ایک ننھا سا بلب جلنے بجھنے لگا۔ تو کیا عبدالرؤف نے دوسری شادی کر لی تھی اور وہ بھی پہلی بیوی کی موجودگی میں۔ میں نے اپنے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے اسے مزید کریدنے کی کوشش کی۔

"اچھا اچھا' رؤف نے ایک بار اپنے خط میں تذکرہ تو کیا تھا۔ آپ غالباً نگہت بھابی ہیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جواب دیا گیا۔ "میرا نام فیروزہ ہے۔۔۔ فیروزہ رؤف۔ نگہت کو رؤف نے چھ ماہ قبل طلاق دے دی تھی۔"

"اوہ!" میں نے ایک طویل سانس خارج کرنے کی اداکاری کی۔ پھر کہا۔ "یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔ آپ کی شادی غالباً حال ہی میں ہوئی ہے۔"

"جی ہاں۔" ریسیور میں فیروزہ کی آواز ابھری۔ "ایک ماہ پہلے ہماری شادی ہوئی ہے۔"

"بہت بہت مبارک ہو بھابی۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "اب تو آپ سے ملاقات ضروری ہو گئی ہے۔ میں کسی دن حاضری دوں گا۔"

"ضرور آیئے گا۔" فیروزہ نے شائستہ لہجے میں کہا پھر اسے کچھ یاد آگیا' پوچھنے لگی۔ "آپ نے اپنا نام کیا بتایا تھا بھائی صاحب؟"

میں نے مذکورہ نام دہرایا' وہ بولی۔ "آپ ہولڈ آن رکھیں میں رؤف کو جگاتی ہوں۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "اگر وہ سو رہے ہیں تو انہیں ڈسٹرب نہ کیجئے۔ میں رات میں فون کر لوں گا۔"

پھر میں نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

عبدالرؤف کی دوسری شادی کا سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے فیروزہ سے غلط بیانی سے کام لیا تھا کہ وہ پہلی بیوی یعنی نگہت پروین کو طلاق دے چکا تھا جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

دھوکے باز عبدالرؤف خود ہی میری گرفت میں آ رہا تھا۔ اب مجھے نگہت کی جانب سے خلع کا دعویٰ دائر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رؤف نے نگہت کی موجودگی میں دوسری شادی رچا کر خود کو ایک مصیبت میں گرفتار کرلیا تھا۔ اب وہ میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا تھا مگر اس سے پہلے مجھے کچھ اور ثبوت حاصل کرنا تھے جن میں سرفہرست متعلقہ ثالثی کونسل کے دفتر سے عبدالرؤف اور فیروزہ کے نکاح نامے کی نقل حاصل کرنا تھی اور یہ ایک وکیل ہونے کے ناطے میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پھر مجھے عبدالرؤف کے ماضی کو کھنگالنے کیلئے ایک چکر لانڈھی کا بھی لگانا تھا۔

دوسرے روز میں نے عبدالرؤف کے آنے سے پہلے پہلے تمام ضروری کام نمٹا لئے تھے۔ اس نے آتے ہی دریافت کیا' آیا میں نگہت کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا ہوں یا نہیں۔

میں نے کہا۔ "بہت مشکل ہو گئی ہے وہ کسی چیز سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے بلکہ وہ مجھ سے شاکی ہے کہ میں تمہاری طرف داری کر رہا ہوں۔"

"احمق عورت ہے وہ۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ "مجھے تو اس پر ترس آ رہا تھا اس لئے سوچا تھا کہ اس کا کچھ بھلا ہو جائے مگر لگتا ہے' وہ اپنی ہی دشمنی پر اتر آئی ہے۔"

"وہ کورٹ میں جانے کیلئے بضد ہے۔" میں نے عبدالرؤف کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں وہ بہت بڑی غلطی کرنے جا رہی ہے۔" میں نے دانستہ یہ بات کہی تھی تاکہ وہ یہی سمجھتا رہے کہ میری ساری ہمدردیاں اسی کے ساتھ ہیں اور میں ان کے درمیان کوئی مک مکا کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

وہ بولا۔ "یہ بات آپ اس بے وقوف عورت کو سمجھانے کی کوشش کریں وکیل صاحب۔ میری آفر ہنوز برقرار ہے۔ میں اسے اب بھی پانچ ہزار روپے دینے کو تیار ہوں۔"

"اور حق مہر کی رقم کا کیا ہو گا؟"

"آپ کس دن کام آئیں گے وکیل صاحب!" وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "کوئی چکر چلائیں جناب۔ آج سے آپ میرے وکیل بن جائیں۔"

"کام بہت مشکل ہے۔" میں نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "اس

مجھے بہت محنت کرنا ہو گی۔"

"میں آپ کی فیس پیشگی ادا کرنے کو تیار ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ کوئی راہ نکالیں۔ عدالت میں جائے بغیر یہیں مسئلہ حل ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے' میں کوئی سبیل کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر اس کام کی ڈبل فیس لوں گا۔"

"آپ کی وکیلانہ چالاکیاں اب کھل کر سامنے آ رہی ہیں۔" اس نے ایک آنکھ دبائی اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔"

اس نے نہایت گرم جوشی سے رخصتی مصافحہ کیا پھر ایک ہفتے بعد آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اس کیس کی اونچ نیچ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا پھر اسی شام میں نے سعادت علی خان کو مطلع کر دیا کہ میں صبح سے قانونی کارروائی کا آغاز کرنے والا ہوں۔

دوسری صبح میں نے مسلم عائلی قوانین مجریہ انیس سو اکسٹھ کے تحت عائلی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ اگلے روز عدالت نے مدعا علیہ کو درخواست دعویٰ کی نقل کے ساتھ سمن بھجوا دیا۔ سماعت کی تاریخ بیس روز بعد کی رکھی گئی تھی۔

میں نے درخواست دعویٰ کے ساتھ مدعا علیہ کا جو ایڈریس تحریر کیا تھا وہ گلشن اقبال کے اسی فلیٹ کا تھا جہاں میں نے عبدالرؤف کی دوسری بیوی فیروزہ سے فون پر بات کی تھی۔ مجھے یہ پتہ حاصل کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں نے ثالثی کونسل کے دفتر سے عبدالرؤف اور فیروزہ کے نکاح نامے کی جو نقل حاصل کی تھی اس کے کالم نمبر چار میں دلہن کی سکونت کا یہی پتہ درج تھا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری سے بھی اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ اس فلیٹ میں فیروزہ رہائش پذیر تھی کیونکہ ٹیلی فون اسی کے نام سے دیا گیا تھا۔

سمن کی تعمیل کرانے والے بیلف کو میں نے خاص طور پر یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس وقت وہاں جائے جب مدعا علیہ اور اس کی دوسری بیوی گھر پر موجود ہوں۔ یا اگر مدعا علیہ گھر میں نہ ملے تو فیروزہ کو وہ کیس کی نوعیت ضرور سمجھا دے۔ یہ احتیاط میں نے

اس لیے برتی تھی کہ فیروزہ کو یہ بات پتہ چل جائے کہ عبدالرؤف نے اپنی پہلی بیوی نگہت کو ابھی طلاق نہیں دی تھی اور نگہت کی موجودگی میں فیروزہ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔

اپنی حسب خواہش کیلئے میں نے بیلف کی کچھ "خدمت" بھی کردی تھی۔

سمن کی تعمیل کے فوراً بعد عبدالرؤف دندناتا ہوا میرے دفتر میں داخل ہوا۔ وہ اس وقت شدید غصے میں تھا۔

"وکیل صاحب! آپ نے بڑی گھٹیا حرکت کی ہے۔ مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ وکیل اتنے بدنام کیوں ہیں؟"

میں نے اس کے جارحانہ رویئے کو نظرانداز کرتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا۔

"آپ تشریف رکھیں اور اطمینان سے مجھے بتائیں کہ آخر ہوا کیا ہے؟"

"آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہوا کیا ہے؟" وہ طیش کے عالم میں بولا۔ "آپ نے نگہت کی طرف سے میرے خلاف استغاثہ دائر کر دیا ہے جب کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ۔۔۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر کہا۔ "میں اپنے وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی راہ نکل آئے۔"

"بھاڑ میں گئی آپ کی مفاہمت اور کنوئیں میں ڈالیں اپنی کوشش کو۔" وہ پھنکار کر بولا۔ "میں پوری بات سمجھ گیا ہوں کہ آپ کون سا کھیل کھیل رہے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ میرے خیالات کو سمجھنے لگے ہیں۔" میں نے بدستور تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "بائی دی وے' آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے کیا؟"

"اونہہ' غلط فہمی۔" اس نے ناپسندیدہ نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں بات کی تہ تک پہنچ گیا ہوں کہ آپ نے مقدمہ کیوں دائر کیا ہے۔"

"ہمیں اپنی فائلیں مکمل رکھنے کیلئے کاغذی کارروائی تو کرنا ہی پڑتی ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "پھر مجھے اپنی موکلہ کو بھی مطمئن کرنا ہے' اس کیلئے کچھ کارکردگی ظاہر

کرنا بھی ضروری ہے۔"

"میں آپ کی لچھے دار باتوں میں آنے والا نہیں ہوں مسٹر غفار بھائی۔۔۔ کم فرام کینیا۔" اس کے لہجے میں طنز ہی طنز چھپا ہوا تھا۔ "نگہت کو میری دوسری شادی کے بارے میں بتا کر تم نے مجھ پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو اسے پتہ چلنا ہی تھا' اچھا ہے' ابھی چل گیا۔" اس کے پراعتماد لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے یقین تھا کہ غفار بھائی بن کر میں نے ہی فون کیا تھا۔

وہ "آپ" سے "تم" پر اتر آیا تھا۔ مجھے اس کا لہجہ سخت ناگوار گزرا تاہم میں نے پیشہ ورانہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "عبدالرؤف صاحب! اب آپ سے عدالت کے کمرے میں ملاقات ہو گی۔ کسی اچھے سے وکیل کا انتظام کرلیں۔ آپ پر بہت کڑا وقت آنے والا ہے۔"

"مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں اپنی موکلہ کیلئے بچا رکھو۔" وہ بدتمیزی سے بولا۔ "فیروزہ نے میرے لئے ایک بہت اچھے وکیل کا انتظام کرلیا ہے۔ وہ تمہارے کیس کی دھجیاں اڑا دے گا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے سانس درست کی پھر بے ہودگی سے قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔ "تم نے تو میری زندگی میں زہر گھولنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مگر فیروزہ بہت اچھی عورت ہے۔ میں نے اسے سیٹل کرلیا ہے۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔ وہ ایک براڈ مائنڈڈ عورت ہے۔"

"ایسی روشن خیال بیوی مبارک ہو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز شامل ہو گیا تھا۔ "عدالت میں پیشی کی تاریخ یاد رکھنا۔"

"میں تمہیں اور تمہاری وکالت کو دیکھ لوں گا۔" وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

مجھے غصہ آگیا' میں نے کہا۔ "ایک وکیل کے دفتر میں گھس کر دھمکیاں دینے' قانونی معاملات میں دخل اندازی کرنے اور خطرناک نتائج سے ڈرانے کے تحت تم پر ان گنت دفعات بھی لگائی جا سکتی ہیں۔ ناؤ یو گیٹ لاسٹ!"

وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

○

پہلی پیشی پر عبدالرؤف نے اپنے وکیل کی مدد سے جواب دعویٰ داخل کر دیا۔

میں نے درخواست دعویٰ میں عبدالرؤف کی بلا اجازت دوسری شادی کو بنیاد بنایا
تھا اور نگہت کے حقوق کے حصول کے لیے استدعا کی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ ضمنی باتیں
بھی تھیں جن کا ذکر مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

عبدالرؤف نے بالکل درست کہا تھا۔ اس نے واقعی ایک مانے ہوئے وکیل کی
خدمات حاصل کی تھیں۔ میں مذکورہ وکیل سے اچھی طرح واقف تھا۔ عائلی مقدمات میں
اس کی اچھی خاصی شہرت تھی۔ عبدالرؤف نے جواب دعویٰ میں بہت بڑھ چڑھ کر لکھا
تھا اور ہر بات کیلئے مورد الزام نگہت کو ٹھہرایا تھا حتیٰ کہ دوسری شادی کیلئے نگہت کی جانب
سے جاری کردہ اجازت نامہ بھی پیش کر دیا تھا۔

یہ واقعی حیرت انگیز بات تھی تاہم میں ہر قسم کی حیرت آفریں صورتحال سے نمٹنے
کیلئے پوری طرح تیار تھا۔ میری موکلہ نے دو چار ملاقاتوں میں بہت سے حقائق سے پردہ
اٹھا دیا تھا۔

عدالت کی ابتدائی تکنیکی کارروائی کے بعد جج نے باقاعدہ سماعت کی تاریخ دے
دی۔ عبدالرؤف کے وکیل نے عدالت سے استدعا کی تھی کہ پہلے اسے جرح کا موقع دیا
جائے اور جج نے میری رضامندی کے بعد اسے اجازت دے دی تھی۔

اگلی پیشی پر میری موکلہ نگہت پروین نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر سچ بولنے کا حلف
اٹھایا تو وکیل صفائی نے جرح کا آغاز کیا۔ نگہت آج بھی پوری طرح لباس میں لپٹی ہوئی
تھی۔

"محترمہ نگہت پروین صاحبہ---"

"آبجیکشن یور آنر!" میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر زوردار آواز میں کہا۔ وکیل
صفائی کو امید نہیں تھی کہ میں یوں اسے آڑے ہاتھوں لوں گا۔ اس کے چہرے پر ناگواری
کے تاثرات تھے۔

جج نے حیرت آمیز نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "بیگ صاحب آپ
کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے اپنے فاضل دوست کے طرز تخاطب پر اعتراض ہے جناب عالی!" میں نے
کہا۔ "میری موکلہ مدعا علیہ عبدالرؤف کی قانونی اور شرعی بیوی ہے۔ اسے نگہت رؤف

لکھا اور پکارا جاتا ہے۔ میں یہ بات دس جگہ لکھی ہوئی ثابت کر سکتا ہوں۔"

جج نے میرے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "وکیل صاحب! آپ
مدعیہ کو نگہت رؤف کہہ کر مخاطب کریں۔"

وکیل صفائی نے کہا۔ "محترمہ رؤف صاحبہ آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ میرے موکل
نے جہیز کے لئے دیئے گئے پچاس ہزار روپے خوردبرد کئے ہیں۔ آپ اپنے دعوے کی سچائی
عدالت میں ثابت کر سکتی ہیں؟"

"رؤف نے وہ رقم فلیٹ خریدنے میں خرچ کر دی تھی۔"

"آپ سے جو پوچھا جا رہا ہے اس کا جواب دیں۔" وکیل صفائی نے تیز لہجے میں
کہا۔ "عدالت میں ثبوت پیش کریں کہ شادی کے موقع پر میرے موکل کو پچاس ہزار
روپے دیئے گئے تھے۔"

سعادت علی خان نے اچانک اٹھ کر کہا۔ "ہم نے بیٹی کو بیاہا تھا کوئی کاروبار نہیں
کیا تھا کہ اسٹامپ پیپر پر گواہوں کی موجودگی میں تحریر کرواتے۔"

جج نے ہاتھ کے اشارے سے سعادت علی خان کو بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔
"عدالتی کارروائی میں مداخلت نہ کریں۔ اگر آپ کی گواہی کی ضرورت پڑی تو آپ کو اپنا
موقف واضح کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔" پھر جج نے وکیل صفائی سے کہا۔ "آپ اپنی
جرح جاری رکھیں۔"

وکیل صفائی نے کٹہرے میں کھڑی نگہت کے نزدیک جا کر کہا۔ "تو آپ کے پاس
اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے کوئی ثبوت نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔"

"محترمہ نگہت پروین--- میرا مطلب ہے' نگہت رؤف صاحبہ!" وکیل صفائی نے
جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے میرے موکل پر الزام لگایا ہے کہ اس نے
آپ کے پرائز بانڈ پر ملنے والی ایک لاکھ روپے کی رقم ہضم کر لی ہے۔ آپ اس بات کو
ثابت کر سکتی ہیں؟"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "جناب عالی! مجھے اپنے فاضل دوست کی عقل پر
افسوس ہو رہا ہے۔ اس احمقانہ سوال کا بھلا کیا جواب دیا جا سکتا ہے۔"

"سوال احمقانہ ہو یا دانش مندانہ' جواب تو بہرحال اس کا دینا ہی پڑتا ہے۔" وکیل صفائی نے تمسخرانہ لہجے میں کہا پھر جج کی جانب مڑ کر بولا۔ "جناب عالی' معزز عدالت سے میں درخواست کرتا ہوں کہ وکیل استغاثہ کو عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے سے روکا جائے۔"

جج نے تنبیہی نظروں سے مجھے دیکھا پھر نگہت پروین سے کہا۔ "بی بی! وکیل صاحب آپ سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔"

وکیل صفائی نے اپنا سوال دہرایا۔ "آپ اپنے دعوے کو ثابت کر سکتی ہیں؟"

"نہیں جناب۔" نگہت نے دو لفظی جواب پر ہی اکتفا کیا۔ اس کے لہجے میں بے بسی جھلک رہی تھی۔

وکیل صفائی نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی' مدعیہ اپنے دعووں کو ثابت نہیں کر سکی جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ میرا موکل بے قصور ہے۔ مدعیہ نے محض میرے موکل کو پھانسنے کیلئے بلیک میلنگ کا یہ جال بچھایا ہے۔"

میں جانتا تھا کہ یہ بات عدالت میں ثابت کرنا اتنی آسان نہیں ہو گی مگر میں نے اس کیس کو اپنے پسندیدہ رخ کی جانب موڑنے کیلئے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس کیلئے ان باتوں کا تذکرہ ضروری تھا۔ بعض اوقات انتہائی غیر اہم بات بھی بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔

وکیل صفائی نے نگہت سے زیورات کے بارے میں بھی سوال کیا۔ حسب سابق وہ زیورات کے سلسلے میں بھی اپنے موقف کو سچ ثابت نہ کر سکی۔

پھر عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

○

اگلی پیشی پر عدالت کے کمرے میں خاصا رش تھا۔ میں نے اپنی حاضری لگانے کے بعد پیش کار سے اپنے کیس کا نمبر معلوم کیا۔ اس نے پانچواں نمبر بتایا تو میں نے اپنے خصوصی تعلقات استعمال کر کے اپنا پہلا نمبر لگوا لیا۔

ایک عدالت میں روزانہ کئی مقدمات کی سماعت ہوتی ہے۔ عام طور پر پہلے' دوسرے اور تیسرے نمبر کی باری آ جاتی ہے ورنہ عدالت کا وقت ختم ہو جاتا ہے پھر شروع کے نمبروں میں ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جرح کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت مل جاتا ہے۔

آج عدالت میں عبدالرؤف کی دوسری بیوی فیروزہ بھی موجود تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال تھی۔ اس نے ایک نہایت چست پھول دار سوٹ پہن رکھا تھا۔ دوپٹے کو مفلر کے اسٹائل میں گردن سے لپیٹ رکھا تھا۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ایک پستہ قامت عورت تھی۔ چست لباس میں اس کا مائل بہ فربہی جسم سراپا احتجاج نظر آتا تھا۔ اس نے آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کے بال جدید انداز میں کٹے ہوئے تھے اور غالباً بالوں میں اس نے کوئی رنگ بھی لگا رکھا تھا۔

آج جرح کی میری باری تھی۔ عبدالرؤف نے کٹہرے میں آنے کے بعد حلف اٹھایا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔

"عبدالرؤف صاحب! میری موکلہ مسمات نگہت رؤف کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ کی قانونی اور شرعی بیوی ہے۔ آپ کو اس کے دعوے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"جو عورت چھ ماہ پہلے گھر چھوڑ کر جا چکی ہو' اس کے بیوی ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"بہت فرق پڑتا ہے۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "بیوی یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ آپ میرے سوال کا جواب دیں۔"

"آپ کا جو دل چاہے' سمجھ لیں۔" اس کے لہجے میں بیزاری عیاں تھی۔

جج نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "آپ سے وکیل صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا ہاں یا نہ میں جواب دیں۔"

"اپنا سوال دہرائیں وکیل صاحب!" اس نے طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے سوال دہرایا۔ وہ بولا۔ "مجھے آپ کی موکلہ کے دعوے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"گویا آپ اسے اپنی قانونی اور شرعی بیوی تسلیم کرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"عبدالرؤف صاحب! آپ نے چھ ماہ پیشتر اپنی قانونی اور شرعی بیوی مسمات نگہت رؤف کو بری طرح زدوکوب کرنے کے بعد گھر سے بے دخل کر دیا تھا۔۔۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔" فاضل وکیل نے میری جرح کے سلسلے کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔ "مدعیہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر گئی تھی اور مار پیٹ والی بات بھی سراسر بہتان ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ "جیسا کہ جہیز کی رقم، زیورات اور انعامی بانڈ کی رقم وغیرہ وغیرہ۔"

جج نے وکیل صفائی کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنے سوال میں سے "بے دخل" اور "زدوکوب" کے الفاظ حذف کر کے جرح جاری رکھوں۔

میں نے جج کے حسب منشاء اپنے سوال میں ردوبدل کرتے ہوئے کٹہرے میں کھڑے ملزم عبدالرؤف سے پوچھا۔

"عبدالرؤف صاحب! آپ کی بیوی چھ ماہ سے اپنے میکے میں رہ رہی ہے اس دوران میں آپ نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ حقوق زوجیت ادا کئے اور نہ ہی اسے نان و نفقہ دیا ہے۔ اس کی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟"

وہ بولا۔ "میں نے کبھی اسے گھر سے نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ جو عورت اپنی مرضی سے خود ہی گھر چھوڑ کر چلی جائے اس کے حقوق زوجیت اور نان و نفقہ کا کیا سوال؟"

عبدالرؤف کے وکیل نے معلوم ہوتا تھا اسے بڑی خصوصی "تیاری" کروائی تھی۔

میں نے کہا۔ "عبدالرؤف صاحب! آپ فیروزہ نامی کسی خاتون سے واقف ہیں؟"

"جی ہاں۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ "ایک فیروزہ تو میری بیوی ہے۔۔ آپ کس فیروزہ کو پوچھ رہے ہیں وکیل صاحب؟"

"بہت بہت شکریہ، آپ نے بالکل درست جواب دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کی دوسری بیوی کے بارے میں ہی جاننا چاہتا تھا۔"

وہ تیوریاں چڑھا کر بولا۔ "کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟"

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "عبدالرؤف صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ پہلی بیوی کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرنا قانوناً جرم ہے؟"

وہ رٹو طوطے کی طرح بولا۔ "جی ہاں، مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔"

"پھر بھی آپ نے یہ سنگین جرم کیا؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل صفائی نے بیچ میں چھلانگ لگائی۔ "جناب عالی! میرے موکل نے دوسری شادی کر کے کوئی جیرم یا بہ الفاظ فاضل وکیل، سنگین جرم نہیں کیا۔ شاید وکیل استغاثہ نے پوری طرح جواب دعویٰ کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔"

پھر وہ میری جانب مڑتے ہوئے بولا۔ "فار یور کائنڈ انفارمیشن مائی ڈیئر کونسلر، میرے موکل نے دوسری شادی کا اجازت نامہ معزز عدالت میں پیش کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے پاس دوسری شادی کیلئے ٹھوس جواز بھی رکھتا ہے۔"

"تھینک یو ڈیفنس۔" میں نے سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا احسان مند ہوں۔"

جج کئی بار دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

"ہاں تو عبدالرؤف صاحب! آپ کے وکیل نے ابھی ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ کے پاس دوسری شادی کیلئے کوئی ٹھوس جواز موجود ہے۔ کیا آپ وہ جواز عدالت کے علم میں لانا پسند کریں گے؟"

"میں نے دوسری شادی کا اجازت نامہ پیش کر دیا ہے۔"

"اسے ہم بعد میں دیکھیں گے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ وہ ٹھوس جواز پیش کریں جس کی بنا پر آپ نے فیروزہ سے عقد ثانی کیا۔"

وکیل صفائی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "جناب عالی! میرے فاضل دوست خواہ مخواہ عدالت کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

جج نے وکیل صفائی کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ

کیا۔

میں نے پوچھا۔ "عبدالرؤف صاحب! عدالت وہ جواز جاننا چاہتی ہے جس کی وجہ سے آپ میری موکلہ پر سوکن لے آئے۔"

"جو عورت اولاد نہ پیدا کر سکتی ہو' اس کا کیا فائدہ؟" وہ غصے سے بولا۔ "مجھے اپنی نسل چلانے کا حق نہیں ہے کیا؟"

"یقیناً یہ آپ کا حق ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ میری موکلہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے؟"

"یہ تو سامنے کی بات ہے۔" اس نے وکیل صفائی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک اس کا پاؤں بھاری نہیں ہوا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "عبدالرؤف صاحب! آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟" پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ "میرا مطلب پہلی شادی سے ہے۔"

اس نے جواب دیا۔ "تقریباً ڈھائی سال۔"

میں نے کہا۔ "میری موکلہ گزشتہ چھ ماہ سے اپنے میکے میں قیام پذیر ہے۔ اگر آپ کی بتائی ہوئی مدت سے چھ ماہ نکال دیئے جائیں تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ آپ دونوں میاں بیوی نے تقریباً دو سال ایک چھت کے نیچے گزارے ہیں یعنی آپ کے ازدواجی تعلقات کا عرصہ دو سال بنتا ہے۔ آپ نے اس عرصے کے دوران میں اپنی بیوی میں کوئی کمی محسوس کی؟"

"اس سے بڑی کمی اور کیا ہوگی کہ اس کی گود ابھی تک ہری نہیں ہوئی۔"

میں نے اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! دو سال کے عرصے میں اگر کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی تو قطعی طور پر یہ فتویٰ صادر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ حالانکہ دنیا میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ بعض جوڑوں کے یہاں شادی کے پندرہ بیس سال بعد اولاد ہوئی ہے۔ اولاد پیدا کرنا کسی انسان یا کسی ڈاکٹر کے ہاتھ میں ہوتا تو دنیا میں کوئی بے اولاد نہ ہوتا۔ اس لئے صرف دو سال کے عرصے میں میری موکلہ کو اولاد پیدا نہ کر سکنے پر بانجھ قرار دے دینا اور اس بنیاد پر دوسری

شادی رچا لینا سراسر ناانصافی اور ظلم کے مترادف ہے۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ ملزم عبدالرؤف سے دریافت کیا جائے کہ اس نے کن وجوہ کی بنا پر میری موکلہ نگہت رؤف کو بانجھ تصور کر لیا ہے۔"

جج نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے عبدالرؤف سے یہی سوال کیا۔ اس نے جواب میں۔ "جناب عالی! یہ بات مجھے ایک تجربہ کار دایہ نے بتائی تھی۔"

"جھوٹ۔۔۔ بکواس۔۔۔" میں نے غضب ناک نظروں سے عبدالرؤف کو گھورا پھر جج سے کہا۔ "جناب عالی! میری موکلہ لگ بھگ ڈیڑھ سال تک شہر کی تین معروف اور نامور لیڈی ڈاکٹروں کے پاس مختلف اوقات میں زیر علاج رہی ہے جنہوں نے اپنے اپنے طور پر نہایت جدید اور مہنگی ترین لیبارٹریز سے اس کے مختلف ٹیسٹ بھی کروائے ہیں۔ تمام لیڈی ڈاکٹروں اور لیبارٹریز کی رپورٹس کے مطابق میری موکلہ سو فیصد بچہ پیدا کرنے کے قابل ہے۔ آپ ان رپورٹس اور ڈاکٹروں کی آراء کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔"

پھر میں نے اپنی فائل میں سے تینوں لیڈی ڈاکٹروں کی آراء مع نگہت پروین کے اس دوران میں کئے گئے ٹیسٹ "پرو لیکٹن ایف آئی اے' الٹرا ساؤنڈ فائنڈ نگز' ڈی ڈی ین سی اور لیپرواسکوپی" کی رپورٹس نکال کر جج کی طرف بڑھا دیں۔

یہ تمام چیزیں مجھے نگہت پروین نے مہیا کی تھیں جو اس نے میکے ہی میں رکھ چھوڑی تھیں۔ وکیل صفائی کے چہرے پر خیمہ زن اطمینان متزلزل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ عبدالرؤف بھی بار بار بے چینی سے کبھی جج کی جانب اور کبھی اپنے وکیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جج نے رپورٹس کے بغور مطالعے کے بعد کٹہرے میں کھڑے ہوئے عبدالرؤف سے سوال کیا۔ "تم نے کبھی اپنا بھی ٹیسٹ کروایا ہے؟"

"میں مرد ہوں' مجھ میں کیا خرابی ہو سکتی ہے۔ ساری گڑبڑ اسی میں ہے۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ "جناب عالی! میں معزز عدالت کی اجازت سے مذکورہ تین لیڈی ڈاکٹروں میں سے ایک کا تبصرہ بعینہ یہاں دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میرے بیان کی تصدیق کیلئے متعلقہ مستند لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔"

جج نے اجازت دے دی۔

میں نے کہا۔ "بقول مذکورہ ڈاکٹر' زمین زرخیز ہے اگر بیج میں قوت نمو ہوئی تو پودا انشاء اللہ ضرور پہنچے گا۔ انتظار فرمایئے۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل صفائی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "اٹ از ٹو مچ۔ میرے موکل کی ذاتیات پر حملہ کیا جا رہا ہے۔"

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "عائلی عدالتوں میں درون خانہ مسائل اور انسان کی ذاتیات ہی زیر بحث آتے ہیں۔ کچھ دیر پہلے تک میری موکلہ کی ذات پر سوال و جواب ہوتے رہے ہیں' اب اگر ملزم عبدالرؤف کی ذات پر بات ہو رہی ہے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟"

"کورٹ از ایڈ جارنڈ!" جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

میں نے درخواست کی۔ "جناب عالی! ابھی میری جرح نامکمل ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ کوئی نزدیکی تاریخ دے دی جائے۔"

جج نے وکیل صفائی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے بتایا کہ آئندہ دس روز تک وہ بہت مصروف ہے۔ چنانچہ جج نے بارہ روزبعد کی تاریخ دے کر عدالتی کارروائی کو آئندہ پیشی تک ملتوی کر دیا۔

○

اگلی دو پیشیوں پر کوئی قابل ذکر عدالتی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔

مجھے یقین کامل تھا کہ مدعا علیہ نے عدالت میں میری موکلہ کی جانب سے جاری کردہ عقد ثانی کا جو اجازت نامہ پیش کیا ہے وہ سراسر جعل سازی کا نمونہ ہے۔ نگہت نے جو انکشافات کئے تھے اس کی روشنی میں' میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا کہ عبدالرؤف نے کیا ڈرامہ کھیلا تھا اور مجھے ایک ایسا سراغ مل گیا تھا جو اس کیس کا پانسا پلٹ سکتا تھا۔

عقد ثانی کے اجازت نامے میں دو گواہان کا بھی ذکر تھا۔ میں نے جج سے درخواست کی۔ "جناب عالی! جیسا کہ مجھے شبہ ہے کہ ملزم عبدالرؤف نے یہ اجازت نامہ میری موکلہ کے علم میں لائے بغیر خود ہی تیار کیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس اجازت نامے پر

ثبت انگوٹھے کے نشان کا میری موکلہ کے فنگر پرنٹس سے موازنہ کیا جائے تاکہ اس بات کی تصدیق ہو سکے کہ آیا یہ نشان انگوٹھا میری موکلہ ہی کا ہے۔ اس سلسلے میں میری التماس ہے کہ نگہت رؤف کے دونوں ہاتھوں کے فنگر پرنٹس کا تجزیہ کیا جائے نیز اس اجازت نامے کے دونوں گواہان بالترتیب مسمی سلطان علی ولد قربان علی سکنہ ناظم آباد اور مسمی محمد شریف ولد کریم بخش سکنہ لیاقت آباد المعروف بہ لالو کھیت کو بطور پابند گواہان بذریعہ سمن آئندہ پیشی پر عدالت میں گواہی کیلئے بلوایا جائے تاکہ یہ کیس جلد از جلد انجام پذیر ہو۔"

میں واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

جج نے میری خواہش کے مطابق متعلقہ عدالتی عملے کو ہدایات جاری کر دیں۔

اگلی پیشی بھی خالی گئی۔ عدالتی عملے نے اطلاع دی تھی کہ گواہ نمبر ایک مسمی سلطان علی نے اپنی رہائش تبدیل کر لی تھی اور گواہ نمبر دو مسمی محمد شریف شہر سے باہر کہیں گیا ہوا تھا۔ البتہ فنگر پرنٹس کی رپورٹ آ گئی تھی اور وہ میری توقع کے عین مطابق تھی۔

جج نے وکیل صفائی کو تاکید کی کہ آئندہ پیشی پر وہ گواہ محمد شریف کو ضرور لے کر آئے۔

اگلی پیشی پر گواہ محمد شریف عدالت میں حاضر تھا۔ وہ پینتیس چالیس سال کا ایک تنومند شخص تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں جنہوں نے اس کے بالائی ہونٹ کو اپنے نیچے چھپا رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

اس نے کٹہرے میں آ کر سچ بولنے کا عہد کیا تو میں نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

"محمد شریف صاحب! اگر میں آپ کو صرف شریف صاحب کہہ کر مخاطب کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

میرے اس عجیب و غریب سوال پر وکیل مخالف نے ناگوار نظروں سے میری طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کے بجائے گواہ محمد شریف بولا۔ "نہیں جی' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

میں نے یہ سوال محض گواہ کو ٹٹولنے اور وکیل صفائی کو سلگانے کی خاطر کیا تھا۔

"شریف صاحب! میں آپ کو ایک تحریر پڑھ کر سنا رہا ہوں۔ پوری توجہ سے سنئے گا۔"

"من کہ مسمات نگہت رؤف زوجہ عبدالرؤف بہ قائمی ہوش و حواس اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ میں نے اپنے شوہر عبدالرؤف ولد تصدق حسین کو عقد ثانی کی اجازت برضا و رغبت اور بلا جبر و اکراہ دے دی ہے اور یہ تحریر روبرو گواہان کے لکھ دی ہے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔"

نگہت رؤف زوجہ عبدالرؤف۔

اسٹامپ پیپر پر لکھی گئی اس قانونی تحریر کے نیچے نگہت رؤف کا نشان انگوٹھا ثبت تھا اور اوتھ کمشنر کی تصدیقی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی مذکورہ دونوں گواہان کا اندراج مع ان کے دستخط تھا۔

میں نے نظریں اٹھا کر محمد شریف کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "شریف صاحب! اس تحریر کے نیچے بطور گواہ آپ کا نام موجود ہے۔ کیا واقعی یہ تحریر آپ کی موجودگی میں لکھی گئی تھی؟"

"جی ہاں' آپ کو شک کیوں ہے؟"

"شریف صاحب! آپ ملزم عبدالرؤف کو کب سے جانتے ہیں؟"

اس غیر متوقع سوال نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا۔ "بہت عرصے سے۔"

"بہت عرصے سے آپ کی کیا مراد ہے؟" میں نے تیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "سو سال۔۔ ہزار سال سے۔۔ لاکھ سال سے۔۔۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل صفائی نے اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "وکیل استغاثہ خواہ مخواہ میرے گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی باتوں سے باز رکھا جائے۔"

جج نے مجھے تنبیہہ کی کہ میں غیر ضروری باتوں سے اجتناب برتتے ہوئے اپنی جرح ٹو دی پوائنٹ جاری رکھوں۔

میں نے جج کی ہدایت کے مطابق ٹو دی پوائنٹ سوال کیا۔ "شریف صاحب! آپ

عبدالرؤف کو کب سے جانتے ہیں؟"

"دس سال سے۔"

"اچھی طرح غور کر لیں۔ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیں' آپ عبدالرؤف کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟"

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر اپنے جواب میں تھوڑی سی لچک پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "کم و بیش دس سال سے۔"

"یعنی ایک دو سال کی کمی بیشی ہو سکتی ہے؟"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل صفائی کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ "فاضل وکیل ان بے معنی سوالات سے آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے جوشیلے لہجے میں کہا۔ "جو سوالات آپ کو بے معنی نظر آ رہے ہیں وہ میرے لئے پر معنی ہیں۔" پھر میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میں گواہ سے بہت اہم سوال کا تصدیقی جواب معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وکیل صفائی کو عدالتی کارروائی میں روڑے اٹکانے سے باز رکھا جائے۔"

جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پوچھا۔ "شریف صاحب! آپ کے بتائے ہوئے عرصے میں دو سال کی کمی بیشی ہو سکتی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کم از کم آٹھ سال سے ملزم عبدالرؤف کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں' ایسا ہی ہے۔"

"جناب عالی!" میں نے جج کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا جائے کہ گواہ محمد شریف ولد کریم بخش' ملزم عبدالرؤف کو عرصہ آٹھ سال سے اچھی طرح جانتا ہے۔"

جج نظریں جھکا کر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے لگا۔

میں نے وکیل صفائی سے کہا۔ "ڈیئر کونسلر' آپ بھی اپنے ریکارڈ کی تکمیل کیلئے نوٹ فرما لیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا' غصے سے منہ دوسری جانب پھیرلیا۔

جج نے نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا' اپنا چشمہ درست کیا پھر پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ "میں اس سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں جناب عالی کہ گواہ سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر نہایت ہی ڈرامائی انداز میں بتایا۔ "جناب عالی! ملزم عبدالرؤف کی عمر ابھی صرف پانچ سال ہے۔"

"یہ کیا خرافات ہے؟" وکیل صفائی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی جلد بازی میں اس کا پاؤں برابر والی کرسی سے الجھ گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس کے چہرے پر خجالت نے ڈیرا جما رکھا تھا۔

میں نے کہا۔ "یہی حقیقت ہے میرے پیارے دوست۔" اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

○

منظر اسی عائلی عدالت کا تھا۔

ملزموں کے کٹہرے میں عبدالرؤف کھڑا بڑی کینہ پرور نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جج نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے دلائل دوں۔ میرا دعویٰ تھا کہ عبدالرؤف ابھی محض پانچ سال کا ہوا تھا۔

گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے محمد شریف ولد کریم بخش نے پرزور تصدیق کی تھی کہ وہ گزشتہ آٹھ سال سے ملزم عبدالرؤف کو جانتا تھا۔

جج نے آج کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ملزم عبدالرؤف کے پاس آ گیا پھر اپنی فائل میں سے ایک پانچ سات سائز کا فوٹو نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "عبدالرؤف صاحب! اسے پہچانتے ہیں آپ؟"

اسے جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ فوٹو کو دیکھتے ہی وہ اچھل پڑا تھا۔ جج بغور اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اپنے سوال کو دہرایا۔

وہ گھگیائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جی ہاں' یہ میرے والد کی تصویر ہے مگر آپ کو یہ کہاں سے ملی؟"

میں اس کے سوال کو نظرانداز کر کے جج کی سمت بڑھ گیا پھر مذکورہ فوٹو اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! یہ فوٹو ملزم عبدالرؤف کے والد صاحب تصدق حسین کا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔"

جج نے ایک نظر فوٹو پر ڈال کر اسے اپنے سامنے رکھ دیا۔

میں عبدالرؤف کی طرف بڑھا اور اپنی فائل سے ایک دوسرا فوٹو نکال کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "انہیں بھی غالباً آپ ضرور پہچانتے ہوں گے؟"

اس تصویر کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اب گرا کہ تب گرا مگر وہ خاصا سخت جان ثابت ہوا اور کٹہرے کا سہارا لے کر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے فوٹو لے کر جج کی خدمت میں پیش کیا پھر کہا۔ "یور آنر' یہ ایک گروپ فوٹو ہے جو کسی شادی کے موقع پر بنایا گیا ہے کیوں کہ اس میں نظر آنے والے چار افراد میں سے دو دلہا اور دلہن ہیں۔ ان کے لباس اس بات کی گواہی دے رہے ہیں۔"

میں نے دانستہ ایک لمحے کا توقف کیا پھر رک رک کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جناب عالی! دلہا اور دلہن بیچ میں کھڑے ہیں۔ دلہا کے بائیں طرف ایک اور صاحب نظر آ رہے ہیں۔ اسی طرح دلہن کی بائیں جانب ایک نوجوان لڑکی کھڑی ہے۔"

وکیل صفائی کی اکتاہٹ آمیز نظروں میں اب دلچسپی کا عنصر نمایاں ہو رہا تھا۔ جج پوری توجہ سے میرے دلائل سن رہا تھا اور عبدالرؤف کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ غیر سے غیر تر ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "جناب عالی! تصویر میں نظر آنے والے دلہا اور دلہن ملزم کے بھائی اور بھاوج یعنی عبدالرؤف کے بڑے بھائی شفقت حسین اور ان کی اہلیہ نائلہ بیگم ہیں۔ یہ

شادی چھ سال قبل لانڈھی میں انجام پائی تھی۔ عبدالرؤف کی بھاوج کے ساتھ نوجوان لڑکی عبدالرؤف اور شفقت حسین کی اکلوتی چھوٹی بہن ناہید ہے اور۔۔۔ افسوس کہ اب یہ تینوں مرحوم ہو چکے ہیں۔"

"یہ چوتھا شخص کون ہے؟" جج نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ جو دلہا کے ساتھ لگا کھڑا ہے؟"

"سمجھ لیں یہ بھی مرچکا ہے۔۔ اور زندہ بھی ہے۔"

"بیگ صاحب! اپنی بات کی وضاحت کریں۔" جج نے میرے دلائل میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! آپ جس شخص کی بابت مجھ سے دریافت کر رہے ہیں اس کا نام فرید حسین تھا مگر یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ گزشتہ پانچ سال سے وہ عبدالرؤف ہے۔ یہی عبدالرؤف جو آپ کے سامنے کٹہرے میں کھڑا ہے۔

عدالت کے کمرے میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔

اس سناٹے کو چند لمحات کے بعد میری گونج دار آواز نے توڑا۔ سب لوگ عبدالرؤف کی طرف سے نظریں ہٹا کر میری جانب متوجہ ہو گئے۔ میں نے سنسنی خیز انکشافات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! ملزم عبدالرؤف۔۔ سابق فرید حسین کی ریپوٹیشن شروع ہی سے اچھی نہیں رہی تھی۔ سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد اس کا "اس بازار" میں بھی آنا جانا رہا اور پیشہ ور عورتوں سے اس کے تعلقات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔۔"

"جناب عالی! مجھے اعتراض ہے۔" وکیل صفائی نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے کہا۔ "فاضل وکیل میرے موکل کی کردار کشی کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی لغو باتوں سے منع کیا جائے۔"

میں نے کہا "جناب عالی! میں فاضل عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی جسارت کیونکر کر سکتا ہوں۔ نہ ہی میں مدعا علیہ کی کردار کشی کا کوئی ارادہ رکھتا ہوں۔ میں تو معزز عدالت کے سامنے حقائق کی نقاب کشائی کر رہا ہوں۔"

جج نے فاضل وکیل کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے مجھے بیان جاری رکھنے کا اشارہ

کیا۔

میں نے کہا۔ "یور آنر' فرید حسین۔۔ میرا مطلب ہے' عبدالرؤف نے ایک رات اپنی شیطانی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ راستہ اپنایا جس کے بارے میں سوچنا بھی گناہ کبیرہ ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے کٹہرے میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس سیاہ بخت نے اپنی بھابی پر مجرمانہ حملہ کیا اور اس کی عصمت دری کی کوشش کی۔ یور آنر پلیز نوٹ اٹ۔ بھابی جیسا مقدس رشتہ' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بھابی ماں کے برابر ہوتی ہے' اس خبیث شخص نے اس محترم رشتے کو پامال کرنے کی کوشش کی۔

"نائلہ کی چیخ پکار سن کر گھر کے دیگر افراد بھی بیدار ہو گئے۔ بڑے بھائی نے اپنی بیوی کو اس کے شیطانی چنگل سے چھڑانا چاہا تو اس نے چاقو کی مدد سے اس پر حملہ کر دیا۔ گھر میں وہ اودھم مچا کہ آس پڑوس کے لوگوں کو بھی خبر ہو گئی۔ اس موقع پر اگر ملزم کا بڑا بھائی شفقت حسین چاہتا تو اسے فوراً حوالہ پولیس کر کے جیل میں سزا دلوا دیتا مگر اس نے انتہائی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس اتنا کہا' میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور آئندہ کبھی اپنی منحوس شکل نہیں دکھانا۔

"البتہ تصدق حسین نے اس موقع پر ایک جرات مندانہ فیصلہ کیا اور اگلی صبح ملزم کو اپنی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد سے عاق کر کے اسے گھر سے نکال دیا۔

میں نے اپنی فائل میں سے ایک اخباری تراشہ نکال کر جج کی طرف بڑھا دیا۔

"جناب عالی" "عاق نامہ" ملاحظہ ہو۔

مجھے یہ تمام معلومات نائلہ کے گھر والوں سے حاصل ہوئی تھیں۔ تصاویر البتہ عبدالرؤف کے والدین سے ملی تھی۔ اس کیلئے میں نے خود کو شفقت حسین کا ایک دیرینہ دوست ظاہر کیا تھا کیوں کہ مجھے نائلہ کے گھر والوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ نائلہ' شفقت حسین اور ناہید ایک کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔

جج نے عاق نامے کو دیکھنے کے بعد مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ عدالت کے وقت کا خیال رکھیں اور اپنے بیان کو ذرا مختصر کریں۔"

میں نے کہا۔ "تھینک یو' یور آنر۔" پھر اپنے بیان کو آگے بڑھایا۔ "فرید حسین

نے گھر سے بے گھر ہونے کے بعد فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنی شخصیت ہی بدل ڈالے گا۔ اس سلسلے میں اس نے سب سے پہلے خود ہی اپنا نام عبدالرؤف رکھا اور اس نئے نام کا شناختی کارڈ بنوا لیا۔ ہمارے ملک میں ایسے کام بہ آسانی ہو جاتے ہیں۔

دو سال تک ملزم مختلف قسم کے کام کرتا رہا پھر ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس کمیشن پر کام کرنے لگا اور گولیمار میں ایک کرائے کے مکان میں اس نے رہائش اختیار کر لی۔"

میں نے رؤف کا ماضی کھنگالنے کیلئے بہت پاپڑ بیلے تھے جواب مزہ دے رہے تھے۔

"بازاری عورتوں سے اس کے روابط بدستور قائم تھے۔ اسی دوران میں اس پر منکشف ہوا کہ وہ ایک پیچیدہ جنسی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ یا وہ عورت کے پاس ہی جانا چھوڑ دے یا پھر کسی گھریلو لڑکی سے شادی کر لے ورنہ اس علاج ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹری مشورے کی پہلی صورت اس کے بس میں نہیں تھی اور دوسری صورت کو اس نے اپنے بس میں بنانے کے لیے ایک جھوٹ کا سہارا لیا اور ایک رشتے کرانے والی عورت کے توسط سے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے میری موکلہ نگہت پروین سے شادی کر لی۔"

"گڈ۔۔ ونڈر فل۔ بڑی دلچسپ کہانی ہے۔" وکیل صفائی نے اٹھ کر کہا۔ "یور آنر' پراسیکیوٹر خوب صورت کہانیاں گھڑنے کے ماہر ہیں۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں بدصورت کہانیوں کو خوبصورت انجام د بھی جانتا ہوں۔"

"آپ کی بیان کردہ کہانی کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وکیل صفائی نے ترش لہجے میں کہا۔

میں نے بھی تیز آواز میں جواب دیا۔ "یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔"

"آپ خواہ مخواہ عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"آرڈر پلیز!" جج نے ہمیں باہمی تکرار سے روک دیا۔

وکیل صفائی نے کہا۔ "یور آنر' ہم اپنے موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔ ہمیں سماعت کیس پر توجہ دینا چاہئے۔"

"ویٹس او کے۔" میں نے کہا۔ "میرے فاضل دوست! آپ خاطر جمع رکھیں

اسی طرف آ رہا ہوں۔"

ایک لمحے کے لئے میں نے حاضرین عدالت پر نگاہ دوڑائی پھر جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! ملزم کی جب شادی ہوئی اس وقت وہ گولیمار میں کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھا پھر جب میری موکلہ کا بانڈ لگا اور اسے انعام ملا تو ملزم نے پہلے سے موجود پچاس ہزار روپے اس میں شامل کر لئے اور کچھ اپنی طرف سے اس میں ملا کر ناظم آباد میں تین کمرے کا ایک فلیٹ خرید لیا جس کی قیمت اس وقت ملزم نے ایک لاکھ پچھتر ہزار ادا کی تھی۔ ایم آئی رائٹ؟"

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔ وہ رقم میں نے مختلف اوقات میں پس انداز کی تھی۔"

"تمہاری سالانہ آمدنی کتنی ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ پریشان نظروں سے وکیل صفائی کی جانب دیکھنے لگا۔

وکیل صفائی نے اٹھ کر کہا۔ "یہ عائلی عدالت ہے یور آنر' کوئی انکم ٹیکس کورٹ نہیں ہے۔ فاضل وکیل غیر متعلق سوال پوچھ رہے ہیں۔"

میں نے متعلقہ سوال پوچھا۔ "ملزم عبدالرؤف! جس دن تمہیں پتہ چلا کہ تمہارا ایک لاکھ کا انعام نکلا ہے اسی رات تم نے ایک اسٹامپ پیپر پر اپنی بیوی نگہت رؤف سے انگوٹھا لگوایا تھا وہ کس سلسلے میں تھا؟"

"ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔"

عبدالرؤف نے چور نظروں سے عدالت کے کمرے میں بیٹھی ہوئی نگہت پروین کو دیکھا اس کی نظر اپنی دوسری منکوحہ فیروزہ کی جانب اٹھ گئی۔ میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"یور آنر' جیسا کہ آپ جانتے ہیں' میری موکلہ نگہت رؤف ان پڑھ ہے۔ تمام عدالتی کاغذات پر آپ اس کے انگوٹھے کا نشان ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے گلا صاف کیا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میری موکلہ کا کبھی بینک میں آنا جانا نہیں ہوا۔ جب ملزم عبدالرؤف نے اسے خوش خبری سنائی کہ میری موکلہ کا انعام نکل آیا ہے تو اس نے کہا کہ وہ خود بینک سے جا کر انعام وصول کر لے۔

ملزم کے ذہن میں پہلے ہی سے ایک شیطانی منصوبہ کلبلا رہا تھا۔ اس موقع کو اس نے غنیمت جانا اور میری موکلہ کی کمزوری سے اس نے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

ملزم نے دن ہی میں اسٹامپ پیپر پر عقد ثانی کا اجازت نامہ تیار کروالیا تھا اور اپنے دو جاننے والوں کا اندراج بطور گواہان کرلیا تھا۔ بعد میں ان کے دستخط بھی لے لیے۔ بس اب میری موکلہ کا انگوٹھا لگنا باقی تھا۔ فاضل عدالت جانتی ہے کہ کورٹ کے باہر موجود وثیقہ نویس اور اسٹامپ فروش ایسی دستاویزات بیس تیس روپے (یہ بائیس تیئس سال پہلے کی بات ہے اب تو سو ڈیڑھ سو سے کم میں ایسا کام ممکن نہیں ہے) میں بنا دیتے ہیں۔ پھر ملزم تو ایک اسٹیٹ ایجنٹ تھا۔ مختلف قسم کی دستاویزات کے سلسلے میں اس کا کورٹ آنا جانا رہتا تھا اور بہت سے متعلقہ لوگوں سے اس کی اچھی خاصی شناسائی بھی تھی۔

میری موکلہ کو یہ جھانسا دیا گیا کہ اسٹامپ پیپر پر "اتھارٹی لیٹر" تیار کیا گیا ہے۔ جس میں عبدالرؤف کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی جگہ اس کے انعام کی رقم بینک سے وصول کرلے۔ وہ اللہ کی بندی اس ہیر پھیر سے قطعی ناواقف تھی حتیٰ کہ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ انعام کی وصولیابی کیلئے ایسی کسی دستاویز کی چنداں ضرورت نہیں ہوا کرتی لیکن انگوٹھا لگواتے وقت ملزم سے ایک سنگین غلطی ہوگئی۔"

جج نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ وکیل صفائی کی سوالیہ نگاہیں بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے گویا عدالت کے کمرے میں بم کا دھماکا کیا۔

"یور آنر' ملزم نے بوکھلاہٹ میں میری موکلہ کا بایاں انگوٹھا لگوالیا تھا۔"

"آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے؟" وکیل صفائی نے اپنے موکل کو بچانے کی آخری کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ثبوت معزز عدالت کے پاس موجود ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میری موکلہ کے فنگر پرنٹس کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ متعلقہ اسٹامپ پیپر پر اسی کے انگوٹھے کا نشان ہے لیکن بائیں انگوٹھے کا۔۔۔ اور میرے فاضل دوست کم از کم اتنا تو جانتے ہی ہوں گے کہ عورت کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا لگوایا جاتا ہے۔ اگر میری موکلہ نے واقعی کسی اوتھ کمشنر کی موجودگی میں اپنے شوہر کو عقد ثانی کا اجازت نامہ دیا ہوتا تو بایاں انگوٹھا لگانے کی غلطی ہرگز ہرگز سرزد نہیں ہوسکتی تھی۔"

فنگر پرنٹس کی رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد جج نے وکیل صفائی سے پوچھا۔ "وکیل صاحب! آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

مخالف وکیل بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے دلائل دیتے ہوئے کہا۔ "یور آنر' عقد ثانی کا اجازت نامہ جعلی ثابت ہوچکا ہے۔ اس کے دو گواہان میں سے ایک لاپتہ ہے' دوسرے کے جھوٹ کی قلعی بھی کھل چکی ہے۔ ملزم کا ماضی اور حال جھوٹ' فراڈ' دھوکا دہی اور بے راہ روی سے عبارت ہے۔ حال ہی میں اس نے دوسری شادی بھی رچالی (عبدالرؤف اور فیروزہ کے نکاح نامے کی فوٹو کاپی میں نے درخواست دعویٰ کے ساتھ منسلک کردی تھی) جب کہ اس کی پہلی بیوی بقید حیات ہے اور خدانخواستہ اس میں کوئی ایسی خامی (بانجھ پن یا بدکردار ہونا) نہیں ہے کہ دوسری شادی کا جواز پیدا ہوسکے۔"

پھر میں نے مسلم عائلی قوانین مجریہ انیس سو اکسٹھ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ "یور آنر' مسلم خاندانی (عائلی) قوانین مجریہ انیس سو اکسٹھ کی دفعہ چھ میں لکھا ہوا ہے۔۔۔ کوئی شخص کسی پہلے کی ہوئی شادی کی موجودگی میں ماسوا ثالثی کونسل کی پیشگی تحریری اجازت کے دوسری شادی نہیں کرے گا۔ نہ ہی کسی ایسی شادی کا' جو ایسی منظوری کے بغیر کی گئی ہو' آرڈیننس ہذا کے تحت اندراج کیا جائے گا۔" میں نے سانس لینے کا وقفہ کیا پھر کہا۔ "جناب عالی! مذکورہ دفعہ کی ذیلی دفعہ دو میں یہ کہا گیا ہے کہ دوسری شادی کیلئے پہلی بیوی یا بیویوں کی رضامندی ضروری ہے۔"

جج نے گھور کر ملزم عبدالرؤف کی جانب دیکھا۔ اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ بہ الفاظ دیگر اس نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا تھا۔

میں نے اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے ملزم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

"یور آنر' مسلم عائلی قوانین کی مذکورہ دفعہ چھ کی ذیلی دفعہ پانچ میں یہ الفاظ درج ہیں۔۔۔ جو ثالثی کونسل کی اجازت کے بغیر دوسری شادی کرے گا وہ (الف) مہر کی تمام رقم موجودہ بیوی یا بیویوں کو فوراً ادا کرے گا خواہ مہر معجل ہو یا موجل اور ایسی رقم جو اس طرح ادا نہ کی جائے' بطور مال گزاری قابل وصول ہوگی اور (ب) شکایت پر سزا یابی کی صورت میں قید محض' جس کی میعاد ایک سال تک ہوسکتی ہے' یا جرمانہ جو پانچ ہزار روپے

تک ہو سکتا ہے یا بیک وقت دونوں سزاؤں کا مستوجب ہو گا۔

جناب عالی! میں مسلم عائلی قوانین کی مندرجہ بالا دفعہ کی روشنی میں فاضل عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ میری موکلہ مسمات نگہت رؤف کو اس کے مہر کی رقم جو بمطابق نکاح نامہ کالم نمبر تیرہ مبلغ پینتیس ہزار روپے سکہ پاکستان رائج الوقت بنتی ہے فوراً دلوائی جائے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "جناب عالی! اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ملزم نے ناظم آباد والا فلیٹ میری موکلہ کی انعامی رقم ہی سے خریدا تھا اس لئے اس سلسلے میں بھی کوئی منصفانہ فیصلہ صادر فرمایا جائے۔" میں نے ایک چانس لیا تھا۔

جج نے میری توقع کے مطابق کہا۔ "آپ کی موکلہ کا یہ دعویٰ ثابت نہیں ہو سکا۔"

پھر میں اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔

جج دس منٹ تک بہ غور اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کے ساتھ مصروف رہا پھ غصیلی نظروں سے ملزم عبدالرؤف کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ ایک ہفتے کے اندر اندر اپنی بیوی نگہت رؤف کا حق مہر ادا کر دیں۔"

پھر حق مہر کی ادائیگی تک ساعت ملتوی کر دی اور ایک ہفتے کی تاریخ دے دی۔

○

ہم عدالت سے باہر آئے تو سعادت علی نے پوچھا۔ "وکیل صاحب! آپ کا ک خیال ہے' عبدالرؤف آئندہ پیشی پر حق مہر ادا کر دے گا؟"

"وہ جج کے فیصلے کا پابند ہے۔ اس کے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "ویسے میرے خیال کے مطابق اس کے پاس اچھی خاص رقم موجود ہے۔ ناظم آباد والا فلیٹ اس نے دو لاکھ پچیس ہزار میں فروخت کیا تھا۔"

اس نے آنکھیں پھیلا کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "وکیل صاحب! کوئی گڑ نہ ہو جائے وہ بہت خطرناک شخص ہے۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں بزرگوار۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس کا سارا نکال دیا ہے اب ایک حقیر کیچوے سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ آئندہ

یہیں ملاقات ہو گی۔" پھر میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

آئندہ پیشی پر عبدالرؤف نے جج کے روبرو مہر کی رقم مبلغ پینتیس ہزار روپے بصورت کیش ادا کر دی۔

اس کے بعد اس نے ایک انتہائی گھٹیا حرکت کی۔ وہ چلتے ہوئے نگہت پروین کے پاس آیا پھر بہ آواز بلند بولا۔ "میں ایک جج اور دو وکیلوں کی موجودگی میں' اس بھری عدالت میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔۔۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔۔۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

اس کے بعد کی عدالتی کارروائی کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

○

اس واقعے کے چھ ماہ بعد ایک روز میں دفتر پہنچا تو اپنی میز پر ایک بڑا سا پیکٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پیکٹ کے ساتھ ہی لفافے میں بند ایک کارڈ بھی موجود تھا۔ پیکٹ کو دیدہ زیب گفٹ پیپر کی مدد سے پیک کیا گیا تھا۔

میرے استفسار پر میری سیکریٹری نے بتایا کہ کوئی فیروزہ نامی خاتون دے گئی ہیں۔

میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر پیکٹ کے ساتھ ٹیپ کیا ہوا لفافہ نکال لیا پھر اسے کھول کر دیکھا۔ میری توقع کے عین مطابق یہ وہی فیروزہ تھی۔۔۔ عبدالرؤف کی دوسری بیوی فیروزہ۔

لفافے کے اندر سے ایک شادی کارڈ برآمد ہوا تھا۔ اس کارڈ کے مطابق مسمات فیروزہ کی شادی مسمی قیصر محمود سے ہو رہی تھی اور نکاح کی تاریخ دو روز بعد کی تھی۔

مجھ پر گویا حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ میں نے کارڈ والے لفافے کے اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ٹٹولا تو اس کے اندر سے ایک تہ کیا ہوا خط برآمد ہوا۔ میں نے جلدی سے اسے کھول کر پڑھا' لکھا تھا۔

"میرے محسن وکیل صاحب!"

میں انتہائی معذرت خواہ ہوں کہ اپنے محسن کا نام تک نہیں جانتی اور آپ کو محض "بیگ صاحب" کہہ کر مخاطب کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔

آپ میری شادی کا دعوت نامہ دیکھ کر یقیناً حیران تو ہوئے ہوں گے۔ لیجئے میں آپ کو زیادہ حیرت میں نہیں ڈالتی۔ یقین جانئے' یہ دعوت نامہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ میں واقعی قیصر محمود سے شادی کرنے جا رہی ہوں جو میرے ہم عمر بھی ہیں اور اس مردود جس کا میں نام لینا بھی گوارا نہیں کرتی' سے اعمال و کردار میں انتہائی مختلف بھی۔ (میں سمجھ گیا کہ مردود سے اس کی مراد عبدالرؤف تھا)

اب اس ناخوشگوار موضوع کو زیر بحث لانا اچھا تو نہیں لگتا تاہم آپ کی الجھن دور کرنے کیلئے مختصراً عرض کرتی ہوں کہ اس نے اس روز عدالت میں نگہت کو طلاق میرے ہی ایما پر دی تھی۔ تمام عدالتی کارروائی کے دوران میں ''اس'' کا مکروہ کردار اور غلیظ باطن میرے سامنے آشکار ہو چکا تھا اور میں نے دل میں ٹھوس فیصلہ کر لیا تھا کہ ''اسے'' عبرت ناک سبق سکھاؤں گی۔ لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ نگہت ایسی معصوم عورت کے ساتھ کوئی زیادتی ہو۔

میں جانتی تھی' جب میں ''اس'' پر لعنت بھیج دوں گی تو وہ دوبارہ نگہت پر مسلط ہو جائے گا جس کی روح پہلے ہی ''اس'' کے ظلم و ستم سے تار تار ہو چکی تھی۔ میں سب سے پہلے اس کی حفاظت کا بندوبست کرنا چاہتی تھی اور اسے اس کا حق دلانا چاہتی تھی۔ نیت کا حال خدا جانتا ہے۔ میں کہاں تک اپنے عمل میں راسخ ہوں' یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ میں ایک عورت ہوں اور میں نے جو کچھ بھی کیا' ایک عورت کی ہمدردی ہی میں کیا۔

جب جج نے ''اس'' کے خلاف فیصلہ سنا دیا اور ایک ہفتے کی مہلت دے دی تو میں نے ''اسے'' مجبور کر دیا کہ وہ مہر کی رقم ادا کرنے کے بعد نگہت کو طلاق دے دے گا اور ''وہ'' میرا مطالبہ ماننے کیلئے مجبور تھا کیوں کہ اس کے بہت سے مالی مفاد مجھ سے وابستہ ہو چکے تھے جن سے وہ کسی بھی قیمت پر دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کی تفصیل میں آپ کو بالمشافہ ملاقات پر سناؤں گی۔

قصہ مختصر' میں نے ایک تیر سے دو شکار کئے۔ نگہت کو ''اس'' کے چنگل سے آزاد بھی کرایا اور چند روز بعد لات مار کر ''اسے'' گھر سے بھی نکال دیا۔ اب ''وہ'' اسی شہر کی کسی سڑک پر آپ کو جوتیاں چٹخاتا ہوا نظر آ جائے گا۔ مقدمے کے دوران میں اس نے ناظم آباد والی اسٹیٹ ایجنسی چھوڑ دی تھی اور اپنا سارا سرمایہ میرے کاروبار میں لگا دیا

تھا۔ اگر ''وہ'' آپ کو نظر آ جائے تو میری طرف سے اجازت ہے۔۔ آپ چاہیں تو ''اسے'' دیکھتے ہی گولی مار دیں۔ آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔

اور ہاں' میں ایک بات تو آپ کو بتانا بھول ہی گئی۔ میں نے تنسیخ نکاح کا مقدمہ دو پیشیوں میں ہی جیت لیا تھا کیوں کہ ''اس'' کی جانب سے کوئی سرگرمی نہیں دکھائی گئی تھی۔ میری شدید خواہش تھی کہ میرا مقدمہ آپ لڑیں مگر میری بدقسمتی کہ ان دنوں آپ یورپ کے تفریحی دورے پر گئے ہوئے تھے اور میں ''اس'' کو آپ کی واپسی تک ایک آنکھ دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔

پیکٹ کے اندر آپ کیلئے ایک گرم سوٹ کا کپڑا اور مٹھائی ہے اور شادی کی تاریخ یاد رکھئے گا۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔۔ فیروزہ۔''

میں نے فیروزہ کے خط کو تہ کر کے شادی کارڈ کے ساتھ ہی لفافے میں رکھ دیا پھر لفافے کو پھول دار پیکٹ کے اوپر رکھ کر اپنی ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ بے ساختہ مجھے سلیم احمد کا یہ شعر یاد آ گیا تھا۔

تو منکر قانون مکافات عمل تھا
لے دیکھ' تیرا عرصہ محشر بھی یہاں ہے

زر پرست

ماہ فروری کے الوداعی ایام تھے۔ کوئٹہ کی جانب سے آنے والی برفیلی ہواؤں نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سردی کی شدت میں غیر معمولی اضافے نے شہریوں کو کپکپا کر رکھ دیا۔ طرفہ تماشا یہ کہ غیر متوقع طور پر برسات کا آغاز ہو گیا۔ مشہور ہے کہ کراچی کے موسم کی سختی تین روز سے زیادہ نہیں رہتی مگر اس سال یہ مقولہ بھی غلط ثابت ہو گیا۔ لگاتار بارش اور خون منجمد کر دینے والی ہواؤں نے کراچی کے باسیوں کو موسم سرما کی حقیقت سے روشناس کروا دیا تھا۔

ایک ایسے ہی نم آلود دن میں دو افراد میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ وہ میاں بیوی نظر آتے تھے' بعد میں میرے خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس روز موسم کی خرابی کے باعث میں نے اپنی سیکرٹری کو جلدی چھٹی دے دی تھی۔ ویسے بھی کام زیادہ نہیں تھا۔ آج بس دو تین کلائنٹ ہی آئے تھے جنہیں میں فارغ کر چکا تھا اور اب خود بھی دفتر سے اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ وہ جوڑا آگیا۔ سردست میں نے اپنے ارادے کو ملتوی کیا اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مرد کی عمر پینتیس چھتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے ایک صاف اور بے داغ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی پیشانی کشادہ اور آنکھیں نمایاں تھیں جن میں ذہانت کی چمک واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ وہ وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے ایک معزز شخص نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والی عورت نے پھولدار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور پرکشش عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس اور چھبیس سال کے درمیان لگایا۔ بہرحال ایک بات تھی' وہ یہ کہ دونوں کی جوڑی

بڑی مناسب تھی۔

میں نے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کے لئے کہا' پھر رسمی علیک سلیک کے بعد ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا "جی' فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ہمیں نظامی صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" خوش لباس شخص نے بتایا "انہوں نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔"

میرے جاننے والوں میں تین نظامی صاحبان تھے۔ میں نے استفسار کیا "آپ کون سے نظامی صاحب کا ذکر کر رہے ہیں؟"

"وہ جو پاک کالونی میں رہتے ہیں۔"

"اچھا!" میں فوراً سمجھ گیا "آپ کی مراد فیروز نظامی سے ہے؟"

مرد گویا ہوا "جی ہاں' بالکل وہی۔ ہم بھی پاک کالونی ہی سے آئے ہیں۔ نظامی صاحب ہمارے پڑوسی بھی ہیں۔"

"آپ نے ابھی تک تعارف نہیں کروایا۔" میں نے مسکرا کر باری باری دونوں کو دیکھا۔

مرد نے جھینپنے والے انداز میں کہا "واقعی۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ میں بہت شرمندہ ہوں وکیل صاحب۔" پھر اس نے تعارف کرواتے ہوئے بتایا "میرا نام خلیق الزماں ہے بیگ صاحب اور یہ میرے ساتھ میری نصف بہتر فوزیہ ہیں۔ ہم حال ہی میں کویت سے یہاں پہنچے ہیں۔ ہمیں آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔"

مرد جس نے اپنا نام خلیق الزماں بتایا تھا' سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ بات کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ فوزیہ نے اس کی استفساریہ نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا "آپ بیگ صاحب کو بلا کم و کاست ساری کہانی سنا دیں۔ میں اس شیطان کے بچے کو پھانسی کے پھندے میں جھولتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے فوزیہ کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ وہ غم و غصے کے ایک نادیدہ طوفان کو اپنے اندر روکے بیٹھی تھی۔

خلیق الزماں نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "بیگ صاحب! آپ کس طرح

کے کیس ڈیل کرتے ہیں؟"

مجھے اس کا یہ بے تکا سوال عجیب سا لگا، تاہم میں نے جواب دیا "میں خصوصاً فوجداری کے مقدمات اور عموماً سول مقدمات لیتا ہوں البتہ سال میں ایک آدھ چیریٹی کیس بھی ڈیل کر لیتا ہوں۔ آپ کے کیس کی نوعیت کیا ہے؟"

اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی، بولا "معاملہ قتل کا ہے۔"

"ذرا تفصیل سے بتائیں۔" میں نے کہا "کس نے کس کو قتل کر دیا ہے؟"

خلیق الزماں کے بجائے فوزیہ نے جواب دیا "بیگ صاحب! تقریباً دو ماہ پیشتر میرے بہنوئی نے میری اکلوتی بڑی بہن کو قتل کر دیا تھا لیکن قاتل قانون کی گرفت میں نہیں آسکا۔ پولیس نے اسے اتفاقی حادثہ قرار دے کر فائل داخل دفتر کر دی تھی۔"

فوزیہ کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا "ابھی آپ کے شوہر نے بتایا ہے کہ آپ لوگ حال ہی میں کویت سے آئے ہیں۔ کیا آپ کی غیر حاضری میں یہ حادثہ پیش آیا تھا؟"

"حادثہ نہ کہیں بیگ صاحب! یہ صریحاً قتل کی واردات ہے۔" خلیق الزماں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا "میں اپنے ہم زلف کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ وہ بدذات دولت کے حصول کی خاطر انتہائی پستی میں بھی گر سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا "یعنی آپ کو یقین ہے کہ آپ کے ہم زلف نے کسی بڑے فائدے کے لئے آپ کی سالی..... کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟"

"ہمیں صد فیصد یقین ہے بیگ صاحب۔" فوزیہ نے پورے وثوق سے کہا۔

میں نے کہا "آپ کے گھر والوں نے..... میرا مطلب ہے، آپ کے والدین نے اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کیوں نہیں کیا؟"

فوزیہ کے چہرے پر غم و اندوہ کی بدلی چھا گئی، افسردہ لہجے میں بولی "ہمارا کوئی عزیز رشتے دار یہاں ہوتا تو پولیس اتنی آسانی سے کیس داخل دفتر نہ کرتی۔ رضوانہ اور میں صرف دو بہنیں تھیں۔ میں گزشتہ ایک سال سے کویت میں مقیم ہوں۔" پھر اس نے خلیق الزماں کی جانب اشارہ کیا "ان کے گھر والے یہاں پاک کالونی میں رہتے ہیں لیکن ان کا رضوانہ باجی کے یہاں آنا جانا بالکل نہیں تھا۔ وجہ میرے منحوس بہنوئی کا

رویہ ہی ہے۔ وہ کسی سے تعلق واسطہ ہی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔"

"اور آپ کے والدین وغیرہ....." میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

فوزیہ بولی "وہ ہم سے بچھڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔"

"آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس طرح ملی؟" میں نے پوچھا۔

"اتفاقاً۔" خلیق الزماں نے بتایا "اگرچہ میرا وہ بد طینت ہم زلف ہم سے رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن پھر بھی ہم مہینے دو مہینے میں ایک آدھ بار فون کر کے رضوانہ کی خیریت دریافت کر لیا کرتے تھے۔ رضوانہ نے کبھی کھل کر تو اپنی پریشانیوں سے ہمیں آگاہ نہیں کیا لیکن ہم جانتے تھے کہ آفتاب عالم سے شادی کا فیصلہ کر کے رضوانہ نے زندگی کی سنگین ترین غلطی کی تھی۔ بہرحال، پندرہ فروری کو ہم نے رضوانہ کو فون کیا۔ آفتاب عالم کے گھر میں اس کے ضعیف والدین بھی ساتھ ہی رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ملازمہ بھی ہے لیکن اس روز ایک اجنبی آواز نے فون ریسیو کیا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ ڈیڑھ دو ماہ قبل رضوانہ چھت سے گر کر ہلاک ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا، وہ کون ذات شریف ہے۔ فون ریسیو کرنے والی نسوانی آواز نے جواب نہیں دیا۔ میں "ہیلو ہیلو" کرتا رہا اور اس نے فون بند کر دیا۔ میرا پریشان ہو جانا لازمی تھا۔ میں نے دوبارہ ڈائل کیا لیکن انگیجڈ ٹون نے میرا استقبال کیا۔ بار بار کوشش کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور ہٹا کر رکھ دیا گیا ہوگا۔

"میں نے فوراً اپنے والدین کو فون کیا تو پتہ چلا، وہ رضوانہ کو پیش آنے والے حادثے سے بے خبر تھے البتہ دوسرے روز میرا چھوٹا بھائی میرے اصرار پر رضوانہ کے گھر گیا۔ اسی روز میرے چھوٹے بھائی رفیق الزماں نے مجھے فون کر کے اطلاع دی کہ واقعی رضوانہ حادثاتی موت کا شکار ہو چکی تھی۔ آفتاب عالم کے بوڑھے والد مشرف حسین نے رفیق الزماں کو بتایا تھا کہ رضوانہ کو یہ حادثہ چوبیس دسمبر کی صبح پیش آیا تھا۔"

"اور آپ کا خیال ہے کہ رضوانہ کو قتل کیا گیا ہے؟" خلیق الزماں کے طویل بیان کے اختتام پر میں نے کہا۔ پھر فوزیہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا "اور آپ اپنی بڑی بہن کے قاتل یعنی اپنے بہنوئی آفتاب عالم کو کیفر کردار تک پہنچانا چاہتی ہیں؟"

وہ غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی "میرے بس میں ہو تو میں اس خبیث کی بوٹیاں نوچ لوں۔"

"ہم دراصل قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہتے۔" خلیق الزماں نے متحمل لہجے میں کہا "ورنہ کرنے کو تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "میں آپ کے دلی جذبات کو سمجھ رہا ہوں اور آپ کے نیک خیالات کا احترام بھی کرتا ہوں۔ قانون کو ہاتھ میں لینا دانش مندی کی علامت نہیں ہے۔"

"اسی لئے تو ہم آپ کے پاس آئے ہیں بیگ صاحب۔" فوزیہ نے کہا "اگر آپ رضوانہ باجی کا کیس لینے کو تیار ہو جائیں تو مجھے امید ہے' ہم انصاف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ نظامی صاحب نے جس انداز میں آپ کی تعریف کی ہے' میرے وثوق کی بنیادی وجہ وہی ہے۔"

"تعریف صرف اس ذات باری کی ہے جس نے ہم سب کو بنایا ہے۔" میں نے انکسار سے کہا "میں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا ہے اور انصاف کے حصول کی جنگ لڑی ہے۔ اس منصف اعلیٰ کا کرم ہے کہ اس نے ہر مرحلے پر میری لاج رکھی ہے۔"

"انشاء اللہ وہ مردود بھی عبرتناک انجام کو پہنچے گا۔" فوزیہ نے خلا میں گھورتے ہوئے پرخیال انداز میں کہا۔

میں نے خلیق الزماں کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا "آپ نے بتایا تھا کہ آپ کا ہم زلف لالچی فطرت کا مالک ہے۔ دولت کے حصول کی خاطر وہ انتہائی پنچ حرکت بھی کر سکتا ہے۔ آپ کے خیال میں رضوانہ کے قتل سے اس کا کون سا مفاد وابستہ تھا؟"

"مالی مفاد بیگ صاحب۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

"ذرا وضاحت کریں۔"

خلیق الزماں نے کچھ دیر توقف کیا' پھر بتایا "رضوانہ کی حادثاتی موت سے آفتاب عالم کو بہت بڑا مالی فائدہ پہنچ سکتا تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ آج کل اسی فائدے کے حصول کی تگ و دو میں لگا ہوگا۔"

"کوئی بیمہ پالیسی کا معاملہ ہے؟" میں نے پوچھا "یا رضوانہ کسی بہت بڑی جائیداد

کی مالک تھی۔"

"آپ بہت ذہین وکیل ہیں۔" اس نے فراخدلی سے میری تعریف کی۔

میں نے کہا "خلیق صاحب! آپ میری ذہانت کو ناپنے کے بجائے واضح الفاظ میں اپنے موقف کی وضاحت کریں۔ اس طرح میرا قیمتی وقت بھی بچے گا اور میں آپ کی بات بہتر انداز میں سمجھ پاؤں گا۔"

"سوری بیگ صاحب۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا "اب میں آپ کو کھل کر بتاتا ہوں۔"

چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے کھل کر بتایا کہ آفتاب عالم نے اپنی بیوی رضوانہ کی ایک بھاری بیمہ پالیسی لے رکھی تھی جو رضوانہ کی حادثاتی موت کے بعد یقیناً اسی کو ملنا تھی۔ اس سلسلے میں آفتاب نے ابتدائی کام مکمل کر لیا تھا۔ اس نے اچھی خاصی رشوت دے کر پولیس سے رضوانہ کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا اور متعلقہ انشورنس کمپنی میں کلیم داخل کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں انشورنس کمپنی کے کلیم ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے والی ایک لڑکی اس کے ساتھ بہت تعاون کر رہی تھی۔ خلیق الزماں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ مذکورہ لڑکی جس کا نام انیلا واسطی تھا' آفتاب عالم کے گھر میں بھی اس کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ اسے یہ بھی شک تھا کہ پندرہ فروری کو جس ناشناس آواز نے اس کی کال اٹینڈ کی تھی' وہ انیلا واسطی ہی ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں' مرحومہ رضوانہ نے تقریباً تین لاکھ روپے مالیت کے سیونگ سرٹیفکیٹ بھی خرید رکھے تھے جو ظاہر ہے' رضوانہ کی موت کے بعد اب آفتاب عالم ہی کی ملکیت تھے۔ آٹھ لاکھ روپے کی پالیسی اور تین لاکھ روپے کے سرٹیفکیٹ کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ گیارہ لاکھ روپے کے لئے قتل کرنا اچنبھے کی بات نہیں تھی اور وہ بھی ایک لالچی اور بدفطرت انسان کے لئے۔

خلیق الزماں کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا "بہت خوب۔ خلیق صاحب! آپ نے تو یہاں آتے ہی اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ آپ کو پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہونا چاہئے تھا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "ویسے...... آپ کویت میں کیا کرتے ہیں؟"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ”پولیس ڈیپارٹمنٹ والی بات سے تو آپ مجھے معاف ہی رکھیں جناب اور آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ کویت میں، میں ایک آئل کمپنی میں فورمین ہوں۔ ایک سال پہلے کویت گیا تھا۔ اپنی محنت، کام سے لگن اور سب سے بڑھ کر خوش قسمتی کے سبب ایک سال ہی میں فورمین بن گیا ہوں۔“

میں نے پوچھا ”آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آپ کے ہم زلف نے پولیس کو بھاری رشوت دے کر حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہے؟“

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا ”پاکستان میں سکہ رائج الوقت بہت بڑی قوت ہے۔ میں نے بھی اسی قوت کو استعمال کیا ہے۔ حالانکہ مجھے یہاں آئے ہوئے کم و بیش ایک ہفتہ ہی گزرا ہوگا لیکن میں نے رضوانہ کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بہت سے حقائق جمع کر لئے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ کے لئے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔“

”خلیق صاحب!“ میں نے پیڈ پر کچھ لکھنے کے بعد سوال کیا ”کیا آپ مجھے یہ کیس صرف اس لئے دینا چاہتے ہیں کہ نظامی صاحب نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے؟“

”ایک وجہ یہ بھی ہے۔“ وہ بولا ”لیکن میں خاص طور پر کسی اچھے.....وکیل کی خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ سیدھا سادہ فوجداری کا معاملہ ہے۔ عدالت خود مجھے سرکاری وکیل مہیا کر سکتی ہے مگر میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔“

”اس میں رسک کی کون سی بات ہے؟“ میں نے پوچھا ”آپ جو شواہد جمع کر چکے ہیں، ان کی بنا پر سرکاری وکیل بہت مضبوط کیس بنا سکتا ہے، پھر آپ میری ہی خدمات کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“

وہ بولا ”بیگ صاحب! سرکاری وکیل کے منہ میں عموماً سرکاری زبان بولتی ہے۔ یہ انتہائی تلخ حقیقت ہے۔ آپ ہمارے ملک کے قانون اور عدالتی نظام کو میری نسبت زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ پولیس کا بھرپور تعاون مجرم کے ساتھ ہو، کسی سرکاری وکیل سے کامیابی کی توقع رکھنا حماقت کے زمرے میں آتا ہے۔“

”ہوں!“ میں نے پرسوچ انداز میں کہا، پھر پوچھا ”کیا پولیس نے رضوانہ کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کروایا تھا؟“

وہ تلخی سے بولا ”پولیس صرف وہی کام شد و مد سے کرتی ہے جس میں ان کا بھلا ہوتا ہو۔ رضوانہ کے قتل کو حادثاتی موت کا رنگ دینے میں ان کا ”بھلا“ ہو رہا تھا، اس لئے پوسٹ مارٹم ضروری ہی نہیں سمجھا گیا۔“

”اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رضوانہ کا کوئی والی وارث یہاں موجود نہیں تھا۔“ فوزیہ نے کافی دیر کے بعد گفتگو میں حصہ لیا ”اگر کوئی اس معاملے کی پیروی کرنے والا ہوتا تو پولیس اتنی آسانی سے اس کیس کو دبا نہیں سکتی تھی۔“

خلیق الزماں نے پرعزم لہجے میں کہا ”لیکن اب گڑے مردے اکھڑ کر رہیں گے۔ افسوس کہ میں وکیل نہیں ہوں ورنہ......“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی، میں نے فوراً کہا ”آپ وکیل نہ ہوتے ہوئے بھی خاصے مستعد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے تعاون سے ہم بہت بہتر نتائج حاصل کر لیں گے۔“

”آپ صرف عدالت کے اندرونی معاملات کو سنبھال لیں بیگ صاحب۔“ وہ بااعتماد انداز میں بولا ”باہر کی بھاگ دوڑ میں خود کروں گا۔ آپ خرچے وغیرہ کی بھی پرواہ نہ کریں۔ میں ہر قیمت پر اس منحوس شخص کو سزا دلوانا چاہتا ہوں۔“

میں نے پوچھا ”آپ کتنی چھٹی لے کر آئے ہیں؟“

”فی الحال دو ماہ کی چھٹی ہے۔“ خلیق الزماں نے بتایا ”لیکن اس مدت میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”ٹھیک ہے۔ اب آپ مجھے تمام حالات تفصیل سے بتا دیں۔“

”گویا آپ ہمارا کیس لینے کے لئے تیار ہیں؟“ فوزیہ نے پوچھا ”فیس ہم آپ کو ڈبل دیں گے۔ اس کی فکر نہ کریں۔“

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”فیس تو میں آپ سے سنگل ہی لوں گا لیکن کیس لینے کا فیصلہ میں پوری بات سننے کے بعد کروں گا۔ کویت کی کمائی کو ذرا سنبھال کر رکھیں۔ انسان اپنے وطن سے دور رہ کر بڑی مشکل سے پیسہ کماتا ہے۔“ آخری بات میں نے

مسکراتے ہوئے کہی تھی۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیگ صاحب۔" خلیق الزماں نے جلدی سے کہا "فوزیہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کے قاتل کو تختہ دار تک پہنچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گی۔"

اس کے بعد دونوں میاں بیوی مجھے رضوانہ کے پس منظر' آفتاب عالم سے اس کی شادی' شادی کے بعد دونوں کے جھگڑے اور باہمی چپقلش' آفتاب عالم کی لالچی فطرت اور کمینہ پن' اس کا رضوانہ کو زد و کوب کرنے وغیرہ کے بارے میں مجھے تفصیلاً بتاتے رہے۔ خاص طور پر خلیق الزماں نے آفتاب عالم کی پولیس سے سازباز اور انیلا واسطی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کیے۔ میں ایک مرتبہ پھر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ شخص اگر پولیس میں ہوتا تو یقیناً بہت ترقی کرتا۔ خیر آئل کمپنی میں بھی اس نے کچھ کم ترقی نہیں تھی۔

ایک گھنٹے کی مزید گفتگو کے بعد میں نے ان کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا اور مشورہ دیا "زیادہ بہتر ہوگا کہ استغاثہ فوزیہ صاحبہ کی جانب سے دائر کیا جائے۔ مدعیہ اگر مقتولہ کی سگی بہن ہوگی تو کیس زیادہ مضبوط بنے گا۔"

دونوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔

میں نے وکالت نامہ نکال کر فوزیہ کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے وکالت نامے کا سرسری جائزہ لینے کے بعد دستخط کر دیئے' پھر بولی "اندراج آپ خود کر لیجئے گا۔"

خلیق الزماں نے میری مطلوبہ فیس نکال کر میرے حوالے کی۔ میں نے فیس کی وصولی کی رسید جاری کر دی اور کہا "میری فیس کے علاوہ کورٹ کے اخراجات بھی آپ ہی کو برداشت کرنا ہوں گے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا "جو آپ کہیں گے وہی ہوگا۔"

پھر کچھ دیر کے بعد وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

اس سے پہلے میں نے خلیق الزماں کے ذمے دو تین نہایت ضروری کام لگا دیئے تھے اور اس نے اس ذمہ داری کو نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ سب سے زیادہ اہم کام انشورنس کمپنی کے کلیم ڈیپارٹمنٹ کی ورکر انیلا واسطی سے متعلق معلومات حاصل کرنا

تھا۔

اگلے تین چار روز میں واقعی خلیق الزماں نے بڑی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ انیلا واسطی اور آفتاب عالم کے تازہ ترین تعلقات کے بارے میں اس کے انکشافات نے اس کیس میں میری دلچسپی کو دوچند کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں خلیق الزماں نے موقع کے ایک اہم ترین گواہ خاکروب مائیکل سے بھی بڑی سودمند ملاقات کی تھی۔ پھر آفتاب عالم کے ماضی کو بھی کھنگال ڈالا تھا۔

میں نے پوری تیاری کرنے کے بعد اپنے وکالت نامے کے ساتھ فوزیہ کی جانب سے عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا۔ عدالت نے ابتدائی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اس حادثے کے انکوائری آفیسر سرفراز شاہ اور ملزم آفتاب عالم کو بذریعہ سمن عدالت میں طلب کر لیا۔ تفتیشی افسر سرفراز شاہ ایک اے ایس آئی تھا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی سے پہلے بہتر ہوگا کہ میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کر دوں تاکہ پیش منظر کو سمجھنا آسان ہو جائے۔ یہ تمام حالات میں ترتیب وار بیان کر رہا ہوں۔ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ واقعات میں تسلسل پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کا ذہن عدالتی کارروائی کے دوران میں کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔

رضوانہ اور فوزیہ دو بہنیں تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ فوزیہ اپنی بہن رضوانہ سے لگ بھگ پانچ سال چھوٹی تھی۔ ان کے والدین نے اچھے وقتوں میں ذاتی گھر بنا لیا تھا۔ اس دو منزلہ گھر کی بالائی منزل کرائے پر اٹھی ہوئی تھی جبکہ زیریں منزل میں فوزیہ اور رضوانہ اپنے والدین کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ ان کا گھر پاپوش نگر میں تھا۔

رضوانہ اور فوزیہ کے والد ایک سرکاری محکمے میں سیکشن افسر تھے لیکن انتہائی ایماندار اور دیانتدار ہونے کے باعث صرف تنخواہ پر گزارہ کرتے تھے۔ ان کی اس خصوصیت کی بنا پر محکمے کے تمام افراد انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

رضوانہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ان کے والد کی معیاد ملازمت پوری ہو گئی۔ البتہ متعلقہ سرکاری محکمے کی جانب سے انہیں پیش کش کی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو

ان کی ملازمت میں مزید پانچ سال کی توسیع ہو سکتی ہے لیکن انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ریٹائرمنٹ لے لی- ان کے اس فیصلے کے پیچھے رضوانہ کی امی کا ہاتھ تھا- وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر باقی ماندہ عمر آرام و سکون سے گزاریں- حکومت کی طرف سے جو فنڈز وغیرہ کی رقم ملی تھی' وہ انہوں نے دونوں بچیوں کی شادی کے لئے بینک میں محفوظ کروا دی تھی- مکان کے بالائی پورشن کا کرایہ بھی آرہا تھا اور بینک سے ماہانہ منافع بھی مل رہا تھا- یہ تمام رقم ملا جلا کر ان چار افراد کی گزر اوقات کے لئے کافی تھی-

فوزیہ نے جب جوانی کی حدود کو چھوا تو رضوانہ گریجویشن کر چکی تھی- اس موقع پر رضوانہ نے ایک اچھا کام یہ کیا کہ ایک انسٹی ٹیوٹ میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھنا شروع کر دی- اس کے والد نے شروع میں اس بات پر اعتراض بھی کیا لیکن رضوانہ ملازمت کا ارادہ کر چکی تھی- اس نے اپنے والد کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا- رضوانہ شروع ہی سے سنجیدہ طبیعت کی مالک تھی جبکہ اس کے برعکس فوزیہ میں لاابالی پن بدرجہ اتم موجود تھا- اس نے کبھی اچھے نمبر حاصل نہیں کیے تھے- بڑی مشکل سے پاس ہوتی تھی-

فوزیہ حسن بے مثال کا شاہکار تھی- اس کی اٹھان ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ لاکھوں میں نہ سہی' وہ ہزاروں میں ایک ضرور تھی- اس کا مطلب یہ نہیں کہ رضوانہ کوئی بدصورت لڑکی تھی- البتہ رضوانہ واجبی سی شکل کی ایک عام سی لڑکی تھی- اس کے سراپا میں ایسی کوئی نمایاں بات نہیں تھی کہ جسے یاد رکھا جا سکے جبکہ فوزیہ کو ایک نظر دیکھنے والا بار بار دیکھنے کی خواہش کرتا تھا- پھر رضوانہ صحت کے معاملات میں بھی خاصی بدقسمت واقع ہوئی تھی- اسے کوئی نہ کوئی مرض لاحق رہتا جس کی وجہ سے وہ دھان پان ہوگئی تھی-

جس گھر میں جوان لڑکیاں ہوں' وہاں رشتے آیا ہی کرتے ہیں- ان کے والدین کو بھی ان کی شادی کی بڑی فکر تھی اور رشتے بھی آرہے تھے لیکن ایک پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی-

والدین یہ چاہتے تھے کہ پہلے رضوانہ کی شادی ہو لیکن لڑکے والے رضوانہ کو

نظرانداز کر کے فوزیہ کو پسند کر لیتے تھے- اس طرح معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا- اس الجھن کو سلجھانے کے لئے رضوانہ کے والد نے ایک ترکیب سوچ لی- انہوں نے فیصلہ کیا کہ جب لڑکے کے گھر والے لڑکی کو دیکھنے آئیں تو وقتی طور پر فوزیہ کو وہاں سے ہٹا دیا جائے یعنی جب فوزیہ وہاں موجود ہی نہیں ہوگی تو پھر مسئلہ بھی پیدا نہیں ہوگا-

یہ ترکیب کامیاب رہی اور ایک لڑکے کی والدہ اور بہن رضوانہ کو پسند کر کے چلی گئیں لیکن کسی طرح لڑکے کو فوزیہ کے بارے میں پتہ چل گیا اور اس نے اس رشتے سے انکار کر دیا- اس طرح بات بنتے بنتے بگڑ گئی-

اس صورتحال نے رضوانہ کو بے انتہاء دلبرداشتہ کر دیا- اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور ایک روز وہ والدین کے سامنے پھٹ پڑی-

"ابو!" اس نے روہانسے لہجے میں اپنے والد کو مخاطب کیا "کیا ضروری ہے کہ پہلے میری ہی شادی ہو؟"

اس کے والد نے نہایت نرمی سے سمجھایا "بیٹی' تم بڑی ہو- اس لئے تمہاری شادی پہلے ہونا چاہئے-"

"یہ کوئی فارمولا تو نہیں ہے-"

"فارمولا نہیں ہے لیکن ہمارے معاشرے کا دستور یہی ہے بیٹی-" اس کی والدہ نے کہا "اگر تمہارے بجائے فوزیہ کی شادی ہم پہلے کر دیں تو تمہارے رشتے کے لئے دشواری پیدا ہو جائے گی- لوگ کہیں گے' بڑی میں کوئی عیب تھا' اس لئے پہلے چھوٹی کو بیاہ دیا-"

رضوانہ نے احتجاجی انداز میں کہا "اگر لڑکے والے میرے بجائے فوزیہ کو پسند کر جاتے ہیں تو اس میں فوزیہ کا کیا قصور ہے؟ اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے؟ اس طرح اس کی شادی کیسے ہوگی؟ میری وجہ سے اس کا نقصان کیوں ہو؟ آپ لوگ میرے رشتے کے انتظار میں اس کا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ آپ میری فکر چھوڑیں اور فوزیہ کی بات کہیں پکی کر دیں-"

"اے ہے' تمہاری فکر کیسے چھوڑ دیں بیٹی-" اس کی والدہ نے سرزنش کی

"ہمارے لئے دونوں بیٹیاں ایک جیسی ہیں۔"

رضوانہ نے تلخی سے کہا "مگر دنیا والے آپ کی نظر سے نہیں دیکھتے۔"

"اللہ کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی دے گا بیٹی۔" اس کے والد نے کہا "تم دل چھوٹا نہ کرو۔ ہم ہیں نا سوچنے کے لئے۔"

بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ تواتر سے رشتے آتے رہے اور رضوانہ کے بجائے فوزیہ کو پسند کرکے جاتے رہے۔ ان کے والدین اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے کہ پہلے شادی بڑی بیٹی کی ہوگی۔ اس دوران میں فوزیہ نے پاسنگ مارکس سے گریجویشن کرلیا۔ اس کا آگے پڑھنے کا ارادہ بالکل بھی نہیں تھا۔ رضوانہ نے بھی فرسٹ ڈویژن میں گریجویشن کرنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا البتہ کمرشل تعلیم اور ہنر سیکھنے کے بعد اس نے ملازمت کا آغاز کر دیا تھا۔ جب صورتحال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں آئی تو اس نے والدین کو اپنے ایک عجیب و غریب فیصلے سے آگاہ کیا۔

ایک روز اس نے اپنی والدہ سے کہا "امی! میں نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" اس وقت اس کی عمر چھبیس سال کے قریب تھی اور ملازمت کرتے ہوئے اسے تھوڑا عرصہ ہی ہوا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟" اس کی والدہ بھونچکا رہ گئیں۔

وہ بولی "میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اگر اب بھی آپ نے فوزیہ کے رشتے کی بات پکی نہیں کی اور میرے رشتے کی راہ دیکھتے رہے تو میں اس گھر میں آنے والے ہر رشتے کو انکار کردوں گی۔"

"تم تو بہت جلد مایوس ہو گئی ہو بیٹی۔" اس کی والدہ نے ہمدردانہ نظروں سے اسے دیکھا "ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کئی گھروں میں پینتیس پینتیس سال کی لڑکیاں بیٹھی ہیں مگر وہ بھی ایسی بے دلی کی باتیں نہیں کرتیں۔"

"بیٹھی ہوں گی پینتیس پینتیس سال کی، میری بلا سے۔" رضوانہ نے بے پروائی سے کہا "میں نے آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے۔ آپ ابو کو بھی بتا دیں۔"

رضوانہ کی والدہ نے اسی رات اپنے شوہر کو ساری صورتحال بتا دی۔ دوسرے روز فوزیہ بھی اپنی بڑی بہن کے اس فیصلے سے واقف ہو چکی تھی۔ اس نے بہت

احتجاج کیا، والدین نے بھی سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن رضوانہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ والدین رضوانہ کی اس عادت سے واقف تھے۔ وہ یا تو کسی بات کی ضد ہی نہیں کرتی تھی یا پھر ایسی ضد کرتی تھی کہ مان کر نہیں دیتی تھی۔

الغرض اس واقعے کے دو ماہ بعد فوزیہ کے لئے خلیق الزماں کا رشتہ آگیا۔ پھر آئندہ چھ ماہ کے اندر اندر فوزیہ بیاہ کر خلیق الزماں کے گھر پہنچ گئی۔ فوزیہ اس گھر سے کیا رخصت ہوئی کہ جیسے لڑکے والے اس گھر کا راستہ بھول گئے تھے۔ کسی نے جھوٹے منہ بھی رضوانہ کا رشتہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ اس بات کا رضوانہ پر الٹا اثر ہوا۔ اس نے زمانے کی بے حسی اور اپنی ناقدری کا رونا رونے کی بجائے خود کو ایک خول میں مقید کرلیا اور اپنی تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

فوزیہ نے آنے والے دو سالوں میں خاصی ترقی کی اور دو بچوں کی ماں بن گئی۔ انہی دو سالوں کے دوران میں رضوانہ مختلف دفاتر میں کام کرتے ہوئے ٹائپسٹ سے اسٹینوگرافر اور اسٹینوگرافر سے پرسنل سیکرٹری ہوگئی۔ اس کی موجودہ جاب ایک کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ کمپنی میں تھی جس کا باس آفتاب عالم تھا اور رضوانہ اس کی پرسنل سیکرٹری۔ اس کمپنی کا دفتر میکلوڈ روڈ پر تھا۔

رضوانہ نے اس دفتر میں آتے ہی اپنی اہمیت کو منوا لیا اور باس کی نظروں میں آگئی۔ دفتر کے باقی اسٹاف سے وہ زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ ہاں اگر کوئی اس سے بات کرتا تو وہ اچھی طرح اس کی بات کا جواب دیتی مگر کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ وہ زیادہ توجہ اپنے کام پر دیتی اور کبھی کام پورا کیے بغیر نہیں اٹھتی۔ وہ یہاں اسٹینوگرافر کی حیثیت سے آئی تھی مگر اس کی بہترین کارکردگی کو دیکھتے ہوئے دو ماہ کے اندر ہی آفتاب عالم نے اسے پرسنل سیکرٹری بنا لیا اور اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا۔

ایک روز آفتاب عالم نے رضوانہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور ایک طویل فہرست اسے تھماتے ہوئے بولا "مس رضوانہ، یہ ایک ارجنٹ کام ہے، اسے فوراً ٹائپ کر دو۔"

"یس سر۔" اس نے باس کے ہاتھ سے وہ فہرست لے لی اور اپنے کیبن میں آکر

ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلانے لگی۔

اس وقت پانچ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ رضوانہ عموماً پانچ بجے آف کرتی تھی لیکن اس طویل فہرست کو ٹائپ کرتے کرتے سوا پانچ ہو گئے۔ اپنا کام ختم کر کے وہ باس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

آفتاب عالم نے اس کے ہاتھ سے فہرست لیتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ مس رضوانہ۔"

رضوانہ آفتاب عالم کی میز کی دائیں جانب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ عموماً اسی کرسی پر بیٹھ کر باس سے ڈکٹیشن لیتی تھی۔ آفتاب عالم نے ٹائپ شدہ فہرست کا جائزہ لینے کے بعد انٹرکام پر چپراسی کو دو کافی لانے کو کہا اور دیوار پر لگے دنیا کے نقشے کو دیکھنے لگا۔

"میں جاؤں سر۔" رضوانہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

آفتاب عالم اس کی جانب مڑتے ہوئے نہایت ہی نرم لہجے میں بولا "میں نے تمہارے لئے کافی منگوائی ہے۔"

رضوانہ کو اپنے باس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔ آفتاب عالم عموماً اس انداز میں بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنے ملازمین پر چیختا چلاتا رہتا تھا یا پھر انتہائی سنجیدہ اور دو ٹوک بات کرتا تھا۔

رضوانہ نے متذبذب لہجے میں کہا "مجھے دیر ہو جائے گی سر۔"

آفتاب عالم نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی' پھر بولا "مس رضوانہ' تمہیں دیر تو ہو چکی ہے۔ آرام سے بیٹھو۔ میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔"

رضوانہ نے کہا "سر' میرا گھر آپ کے راستے میں نہیں پڑتا۔ آپ خوامخواہ زحمت نہ کریں۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے رضوانہ۔" آفتاب عالم نے کہا "پھر میں نے کافی منگوائی ہے' وہ تو پیتی جاؤ۔"

رضوانہ نے زیادہ انکار مناسب نہ سمجھا اور بیٹھ گئی۔ آفتاب عالم نے پہلے کبھی اسے یوں اپنے کمرے میں بٹھا کر کافی نہیں پلائی تھی۔ وہ اپنے باس کے رو...

سوچنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ آفتاب عالم ان دنوں تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا جس کے بعد وہ خاصا چڑچڑا اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی فیروزہ بیگم کچن میں اچانک آگ بھڑک جانے کی وجہ سے موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔

کافی پینے کے دوران میں آفتاب عالم اپنی میز پر رکھی ہوئی مختلف چیزوں کی ترتیب بدلتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے درازوں میں بھی جھانکا۔ رضوانہ نے صاف طور پر محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن موزوں الفاظ کی تلاش میں ہو۔ عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے رضوانہ نے اپنے باس کی کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ آخر کار وہ بول اٹھا۔

"مس رضوانہ' تمہیں اس دفتر میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"یکم ......کو تین ماہ ہو جائیں گے سر۔"

آفتاب عالم نے کہا "تم نے بہت مختصر مدت میں اپنی صلاحیتوں کو لوہا منوا لیا ہے۔ میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوں۔"

"تھینک یو سر۔"

"میں نے بہت کم ایسے ورکرز دیکھے ہیں جو صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہوں اور ان کی پوری توجہ اپنے فرائض کی ادائیگی پر لگی رہے۔" وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا' پھر بولا "میں ایسے ملازمین کو پسند کرتا ہوں جو خود کم بولتے ہوں اور ان کا کام زیادہ بولتا ہو۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

رضوانہ نے مختصر سا جواب دینے پر اکتفا کیا۔ وہ عموماً ایسے ہی الفاظ بولتی تھی "او کے سر' یس سر' تھینک یو سر' ٹھیک ہے سر" وغیرہ وغیرہ۔

"یس سر' میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

آفتاب عالم بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری بہترین کارکردگی کے پیش نظر اس ماہ تمہاری تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے۔"

رضوانہ نے چونک کر اسے دیکھا "سر' آپ نے تو پچھلے ماہ ہی میری تنخواہ بڑھائی

تھی۔"

"مجھے یاد ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "میں نے ہمیشہ محنتی ورکرز کی قدر کی ہے۔ میں اس کمپنی سے جو کچھ کماتا ہوں' اس میں دیانتدار ملازمین کی محنت بھی شامل ہوتی ہے۔"

رضوانہ خاموش ہو گئی۔ آج اسے اپنا باس خاصا بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پہلے والا تند مزاج اور غصہ ور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پھر ان کے درمیان دفتری امور سے ہٹ کر باتیں ہونے لگیں۔ رضوانہ بس "ہوں' ہاں" کر رہی تھی اور آفتاب عالم اسے اپنی نجی زندگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ آفتاب عالم نے رضوانہ سے بھی ذاتی نوعیت کے کچھ سوالات کیے جن کا اس نے نہایت ہی مختصر جواب دیا تھا۔

رضوانہ نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ اس روز وہ اپنے باس سے بات کرتے ہوئے کسی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ پہلے سے آپس میں بے تکلف ہوں۔ شاید اس کی بڑی وجہ آفتاب عالم کا بدلا ہوا خوشگوار رویہ ہی تھا۔

پھر رفتہ رفتہ ان کے درمیان بے تکلفی کی فضا قائم ہونے لگی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد رضوانہ کو محسوس ہوا کہ آفتاب عالم سے ڈھیروں باتیں کرنے کے باوجود بھی جی نہیں بھرتا تھا۔ وہ زندہ دل شخص رضوانہ کے دل میں گھر کرتا چلا جا رہا تھا۔ رضوانہ کی زندگی پر طاری جمود آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگا۔ اب اسے اپنے اردگرد کی ہر چیز اچھی لگنے لگی تھی۔ اس کے اندر کا موسم بڑی تیز رفتاری سے تبدیل ہوا تھا۔ وہ خود کو خوش قسمت ترین لڑکی سمجھ رہی تھی کہ اس جیسی معمولی شکل و صورت کی لڑکی پر ایک وجیہہ و شکیل مرد جان دینے لگا تھا اور اس کو اپنانے کے لئے انتہائی سنجیدہ بھی تھا۔

وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ اچانک ملنے والی خوشی یا غم چھپائے نہیں چھپتا۔ اس کا تاثر چہرے پر...... چمکنے لگتا ہے۔ رضوانہ کے مزاج و عادات میں پیدا ہونے والی تبدیلی کو والدین نے فوراً محسوس کیا۔

"یہ آج کل ہماری بیٹی کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔" ایک رات رضوانہ کے والد نے

اپنی بیوی سے استفسار کیا۔

وہ بولیں "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نے بھی اس میں بہت تبدیلی محسوس کی ہے۔ بڑی زندہ دلی اور خوشی کا مظاہرہ کر رہی ہے ان دنوں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ بولے "دو سال سے تو یہ بالکل مردوں کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ ہر چیز سے بے زار اور نالاں۔" ایک لمحے کو رک کر انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا "زمانہ بہت خراب ہے بیگم۔ تم ذرا رضوانہ میں رونما ہونے والی تبدیلی کے اسباب کا کھوج تو لگاؤ۔ کہیں خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات......"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی؟" انہوں نے شوہر کی بات کاٹ دی "زمانہ خراب ہے تو ہوا کرے' ہمیں اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے۔"

رضوانہ کے والد نے کہا "اعتماد اپنی جگہ لیکن ہم والدین ہیں۔ ہمیں اپنی بیٹی کی مصروفیات کا علم رہنا چاہئے۔"

رضوانہ کی والدہ بات کی تہہ تک پہنچ گئیں۔ انہوں نے کہا "ٹھیک ہے' میں رضوانہ کو کریدنے کی کوشش کروں گی۔"

لیکن انہیں کوئی کوشش نہیں کرنا پڑی۔ رضوانہ نے خود ہی ان کا کام آسان کر دیا۔ اس کے اندر اچانک پیدا ہونے والی تبدیلیوں نے اس کے عزائم کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ اپنے لباس کا خیال رکھنے لگی تھی اور میک اپ پر بھی توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آفتاب عالم اس کی زبان کے راستے اس کے گھر تک چلا آیا تھا۔

"آفتاب صاحب نے بتایا ہے کہ دو ماہ بعد میری تنخواہ مزید بڑھ جائے گی۔"

"آفتاب صاحب میرے کام سے اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے ہی اس عید پر مجھے بونس بھی ملے گا۔"

"کل آفتاب صاحب کے والد بھی دفتر آئے تھے۔"

"آفتاب صاحب کے والد بہت خلیق اور مہربان انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے بیٹی کہہ کر سر پر ہاتھ بھی پھیرا تھا۔"

"آفتاب صاحب کو اس سال بہت زیادہ منافع ہوا ہے۔ وہ اپنے دفتر میں میری آمد

کو اپنی خوش بختی سے تعبیر کرتے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ

ایک روز رضوانہ کی والدہ نے محتاط انداز میں کہا "بیٹی تمہارے باس کی تعریف سن سن کر ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔ ان سے کہو' کبھی اپنی بیوی کے ساتھ ہمارے گھر آئیں۔"

رضوانہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی "امی' ان کی بیوی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب' کیا ابھی تک انہوں نے شادی نہیں کی؟"

"شادی تو کی تھی۔" رضوانہ نے بتایا "لیکن کچھ عرصہ قبل ان کی بیگم کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"اوہ!" رضوانہ کی والدہ کے چہرے پر تفکر نظر آنے لگا۔

رضوانہ نے کہا "آپ پریشان کیوں ہو گئیں۔ کیا آفتاب صاحب اکیلے ہمارے گھر نہیں آسکتے؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس کی والدہ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

رضوانہ نے کہاک "اچھا ہوا' آپ نے خود ہی کہہ دیا ورنہ میں تو آفتاب صاحب کو گھر آنے کی دعوت دینے ہی والی تھی۔"

"ہاں ہاں' ضرور بلاؤ انہیں بیٹی۔" اس کی والدہ نے جلدی سے کہا' پھر پوچھا "آفتاب صاحب کی عمر لگ بھگ کتنی ہو گی؟"

"میرا خیال ہے اڑتیس انتالیس سال ہو گی۔"

رضوانہ کی والدہ کے چہرے پر اطمینان جھلک اٹھا۔ رضوانہ اس وقت اٹھائیس سال کی ہو چکی تھی۔ ان کے خیال میں یہ ایک مناسب جوڑی تھی۔ اگرچہ رضوانہ نے واضح الفاظ میں کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس کی والدہ سب کچھ سمجھ رہی تھیں۔ پھر یہی سب کچھ انہوں نے اپنے شوہر کے گوش گزار کر دیا۔

"یہ تو مناسب نہیں ہے۔" رضوانہ کے والد نے فوراً اعتراض کر دیا "رضوانہ صریحاً غلطی کرنے جا رہی ہے۔"

"اس میں نامناسب والی کون سی بات ہے؟" رضوانہ کی والدہ نے پوچھا "اس سے اچھا رشتہ رضوانہ کے لئے کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمہاری بات میں بھی وزن ہے لیکن جانے کیوں' میرا دل مطمئن نہیں ہے۔"

"آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولیں "یہ بھی تو دیکھیں کہ یہ رضوانہ کی اپنی پسند ہے ورنہ وہ تو سرے سے شادی ہی سے انکاری تھی۔"

"وہ ہم سے زیادہ اپنا برا بھلا نہیں سوچ سکتی۔"

"میرا خیال آپ سے مختلف ہے۔" رضوانہ کی والدہ نے کہا "اور میرا خیال یہ ہے کہ اپنا برا بھلا سب سے زیادہ خود رضوانہ ہی سوچ سکتی ہے۔"

"تم بیٹی کی حمایت میں بہت سی باتوں کو بھول رہی ہو۔"

"میں بیٹی کو نہیں بھولنا چاہتی' اس لئے بہت سی باتوں کو نظرانداز کر رہی ہوں۔"

رضوانہ کی والدہ نے مدبرانہ لہجے میں کہا "آپ تو اس کی ضدی طبیعت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اگر ہم نے اس کے راستے میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو ممکن ہے۔"

اچانک انہوں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے رضوانہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

"میں کافی دیر سے آپ کی گفتگو سن رہی ہوں۔ اگرچہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت ہے مگر بہرحال مجھ سے یہ حرکت سرزد ہو چکی ہے۔ میں باہر دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی۔"

اس کے والد نے کہا "بیٹی' میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ جو اونچ نیچ میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتی ہو۔ میں جو بھی کروں گا' تمہاری بہتری کے لئے ہی کروں گا۔"

رضوانہ نے گردن جھکا دی "مجھے افسوس ہے ابو کہ آپ کو میرے فیصلے سے دکھ پہنچا ہے۔"

"نہیں بیٹی' ایسی بات نہیں ہے۔" وہ اندرونی کرب کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "میں چاہتا تھا کہ ذرا فوزیہ اور خلیق الزماں سے بھی مشورہ کر لوں۔"

رضوانہ نے کہا "زندگی مجھے گزارنا ہے ابو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹی لیکن دنیاداری بھی ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے' آپ دنیا داری کے تقاضے پورے کریں لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے۔" وہ قطعیت سے بولی۔

اس سے پہلے کہ اس کے والد کچھ پوچھتے' وہ کمرے سے جا چکی تھی۔ وہ افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے "یہ اب ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔"

ان کی بیوی نے کہا "ایسا نہ کہیں۔ رضوانہ نے زندگی میں پہلی بار ہم سے کچھ مانگا ہے۔ آپ اپنے اندر ذرا لچک پیدا کریں۔ کہیں آپ کی مخالفت اس کے اندر بغاوت کے جذبات نہ پیدا کر دے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ واقعی ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" وہ نیم دلی سے بولے "پھر بھی فوزیہ اور خلیق الزماں کو اس معاملے میں شریک کرنا ضروری ہے۔"

"میں نے کب منع کیا ہے۔" وہ جلدی سے بولیں "میرا خیال ہے انہیں رضوانہ کے اس فیصلے سے خوشی ہوگی۔"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

قصہ مختصر' طے یہ پایا کہ جس روز آفتاب عالم ان کے گھر آئے' اس روز فوزیہ اور خلیق الزماں کو بھی بلا لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

رضوانہ کا فیصلہ دوٹوک اور اٹل تھا۔ خلیق الزماں اور فوزیہ سے رائے لینا اتمام حجت سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ طے یہ پایا کہ دو ماہ بعد آفتاب عالم برات لے کر آجائے۔ اس دوران میں رضوانہ نے دفتر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ آفتاب کی دلہن بن کر اس کے گھر میں جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

کہنے کو دو ماہ بہت کم مدت ہوتی ہے' دن پلک جھپکتے میں گزر جاتے ہیں لیکن اس عرصے کے دوران میں رضوانہ کے گھر پر ایک قیامت سی گزر گئی۔ اس کے والد نمونیا کا شکار ہو کر چند روز کے اندر ہی چل بسے۔ اس کی والدہ اپنے شوہر سے دائمی جدائی کی تاب نہ لا سکیں اور ایک ماہ کے بعد ہی وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

رضوانہ پر بڑا کڑا وقت آن پڑا تھا مگر اس کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس نے

اس مصیبت کے دنوں میں صبر و برداشت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اس صدمے کو جھیل گئی۔ اب وہ گھر میں اکیلی رہ گئی تھی' اس لئے فوزیہ کے اصرار پر خلیق الزماں اپنے بچوں کے ساتھ وہاں شفٹ ہو گیا۔

رضوانہ کی والدہ کا چہلم ہو چکا تو آفتاب عالم نے شادی کا تقاضا شروع کر دیا۔ رضوانہ کی آمادگی کو دیکھتے ہوئے خلیق الزماں اور فوزیہ نے رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح بالآخر چند روز بعد رضوانہ' آفتاب عالم کی بیوی بن کر اس کے گھر پہنچ گئی۔ آفتاب عالم کی رہائش طارق روڈ کے سنٹرل کمرشل ایریا میں تھی۔

خلیق الزماں اور فوزیہ بدستور پاپوش نگر والے گھر میں رہ رہے تھے۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی آفتاب عالم نے کینچلی بدلی۔ اس نے رضوانہ پر زور دیا کہ وہ پاپوش نگر والے گھر سے اپنا حصہ وصول کر لے۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔" رضوانہ نے حیرانی سے کہا "والدین کی وفات کے بعد اس گھر پر ہم دونوں بہنوں کا برابر کا حق ہے۔ میں اپنا حصہ کیسے وصول کر لوں؟"

آفتاب عالم نے کہا "میں بھی تمہیں یہی بات سمجھانا چاہتا ہوں۔ اس گھر پر تم دونوں بہنوں کا حق ہے...... لیکن معاف کرنا' تمہاری چھوٹی بہن مع اپنے بچوں اور شوہر کے اپنا حق پوری طرح وصول کر رہی ہے اور تمہیں دودھ میں سے پڑی مکھی کی طرح نکال باہر کیا ہے۔ تمہیں چاہے برا لگے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ تمہارے بہنوئی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اس مکان پر مستقل قبضہ جمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" رضوانہ نے الجھن آمیز لہجے میں کہا "فوزیہ کی نیت میں کوئی کھوٹ ہے اور نہ ہی خلیق الزماں لالچی فطرت کے مالک ہیں۔ میں ان دونوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ وہ تو محض میری تنہائی دور کرنے اس گھر میں آئے تھے۔"

آفتاب عالم نے طنزیہ انداز میں کہا "اور ابھی تک تمہاری تنہائی دور کرنے کے لئے وہاں جمے ہوئے ہیں!"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔"

"میں نے تو تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔" آفتاب عالم نے اپنے لہجے میں مصنوعی اپنائیت بھرتے ہوئے کہا "آگے تمہاری مرضی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ تمہاری بہن تمہاری دشمن ہے مگر تمہارے بہنوئی پر مجھے بھروسہ نہیں ہے۔ وہ بہت کائیاں شخص ہے۔ تم دیکھنا' ایک روز وہ پورا مکان ہی ہڑپ کر جائے گا اور تمہیں خبر ہی نہ ہوگی۔"

رضوانہ اپنے شوہر کے رویئے کے بارے میں جتنا سوچتی' اس کا ذہن اتنا ہی الجھتا جاتا تھا۔ چند روز کے وقفے سے آفتاب عالم نے پھر اسی نوعیت کی باتیں شروع کر دیں۔ زچ ہو کر رضوانہ پوچھ بیٹھی۔

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟"

آفتاب عالم نے صاف صاف کہہ دیا "دیکھو رضوانہ' ہمیں اپنے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ تمہارا مستقبل اب مجھ سے وابستہ ہے۔ اگر مجھے کسی بات سے فائدہ پہنچے گا تو یقیناً وہ تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ رضوانہ نے پوچھا "خدا خیر کرے' کیا پریشانی ہے آپ کو؟"

آفتاب عالم نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا "رضوانہ تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہے اور نہ ہی میں نے تمہیں بتانے کی کبھی کوشش کی ہے۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر خاموش ہو گیا۔ رضوانہ نے پوچھا۔

"آپ کس بات کا ذکر کر رہے ہیں؟"

"وہ بات یہ ہے رضوانہ" اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا "آج کل بزنس بہت ڈاؤن جا رہا ہے۔ اگر کچھ عرصہ یہی صورتحال رہی تو سمجھو کہ کاروبار بالکل ہی ٹھپ ہو جائے گا لیکن اگر تم چاہو تو اس نازک موقع پر اس ڈوبتے ہوئے کاروبار کو سنبھالا دے سکتی ہو۔"

"میں...... مگر کس طرح؟" وہ سوالیہ لہجے میں بولی۔

"مجھے فوری طور پر کچھ رقم کی ضرورت ہے۔" وہ چالاکی سے بولا "اگر تم اس کا انتظام کر دو تو......"

رضوانہ نے اس کی بات کو قطع کرتے ہوئے کہا "میں بھلا رقم کا انتظام کس طرح کر سکتی ہوں؟"

"بہت آسانی سے۔" آفتاب عالم کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "اگر پاپوش نگر والے مکان کو فروخت کر دیا جائے تو تمہارے حصے میں آنے والی رقم میرے بہت کام آسکتی ہے لیکن لگتا ہے تمہیں میری پریشانی سے کوئی غرض نہیں ہے۔"

"ہوں۔" رضوانہ سوچ میں پڑ گئی۔

آفتاب عالم نے رضوانہ کو سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر کہا "تمہارے بہنوئی کے پاس رہنے کو ذاتی گھر موجود ہے۔ تم اپنے گھر میں خوش و خرم ہو۔ پاپوش نگر والے گھر کی فروخت سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ ویسے تمہاری مرضی ہے۔ میں تمہیں زبردستی تو اس کام پر مجبور نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں اپنا سمجھ کر یہ تجویز پیش کی تھی کیونکہ ہم دونوں کا مفاد اب ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں فوزیہ سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔" رضوانہ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

آفتاب عالم جلدی سے بولا "میرا خیال ہے' اسے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں کوئی نامناسب بات بھی نہیں ہے البتہ تمہارا بہنوئی کوئی رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔"

رضوانہ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی "دیکھتے ہیں' کیا ہوتا ہے۔"

لیکن بات ختم نہیں ہو سکی۔ خلیق الزماں نے مکان کی فروخت کی مخالفت کی۔ اس کا موقف یہ تھا کہ آفتاب عالم رضوانہ کو بے وقوف بنا رہا تھا لیکن رضوانہ اپنے شوہر کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ فوزیہ نے بھی رضوانہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ آفتاب عالم کاروبار کی خرابی کا بہانہ بنا کر اس سے رقم ہتھیانا چاہتا تھا ورنہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ماشاء اللہ اس کا کاروبار اچھا خاصا چل رہا تھا۔ رضوانہ اپنی بات پر ڈٹی رہی' چنانچہ فوزیہ اور خلیق الزماں کو اس کے سامنے ہتھیار پھینکنے پڑے۔ پاپوش نگر والا دو منزلہ مکان چھ لاکھ میں فروخت ہو گیا۔ خلیق الزماں نے

رضوانہ کے حصے کے تین لاکھ روپے اسے دیتے ہوئے کہا۔

"رضوانہ! تم میری چھوٹی بہن کی طرح ہو۔ میں بڑا بھائی ہونے کے ناطے تمہیں مشورہ دوں گا کہ اس رقم کو سوچ سمجھ کر استعمال کرنا۔ ٹھیک ہے' تم اپنے شوہر پر بہت اعتماد کرتی ہو لیکن مجھے اس پر ذرا اعتبار نہیں ہے۔ بہرحال' یہ تمہاری رقم ہے۔ میں مشورہ ہی دے سکتا ہوں۔ تمہیں کسی بات کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔"

فوزیہ نے کہا "رضوانہ' میری مانو تو اس رقم کو کسی اسکیم میں لگا دو۔ کوئی سرٹیفکیٹ وغیرہ خرید لو۔ تمہاری رقم بڑھتی رہے گی۔"

رضوانہ کو ان کے مشورے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے تین لاکھ روپے کی رقم لے جا کر اپنے شوہر آفتاب عالم کے ہاتھ پر رکھ دی۔ وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ رضوانہ اس وقت خود پر بہت فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس نے ایک انتہائی نازک موقع پر اپنے شریک حیات کی مدد کی تھی۔ وہ بے وقوف اس منصوبے سے بے خبر تھی جو عیار آفتاب عالم کے ذہن میں ترتیب پا چکا تھا۔

ایک ماہ بعد آفتاب عالم نے اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کیا۔ ایک رات وہ دفتر سے واپس آیا تو اس کی ایک ایک ادا سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ رضوانہ اس خوشی کا سبب پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"کیا بات ہے' آج آپ خلاف معمول بہت خوش نظر آرہے ہیں؟"

"بات ہی ایسی ہے رضوانہ۔" وہ اسے بانہوں میں بھرتے ہوئے بولا "تم میرے لئے واقعی بہت خوش بخت ثابت ہو رہی ہو۔"

"میں بھی تو سنوں' آخر ایسا کیا ہو گیا۔" رضوانہ نے کہا۔

وہ اپنی جیب سے ایک پھولا ہوا خاکی لفافہ نکال کر رضوانہ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا "یہ لو' گن لو۔ پورے تین لاکھ روپے ہیں۔ تمہاری یہ رقم مجھ پر قرض تھی۔"

رضوانہ نے حیرانی سے اسے دیکھا "میں سمجھی نہیں' آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ گزشتہ ماہ میں نے تم سے تین لاکھ روپے لے کر کاروبار میں لگائے تھے۔" آفتاب عالم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "میں نے رقم لیتے وقت

ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ روپے مجھ پر قرض ہوں گے اور جیسے ہی کوئی بہتر صورت نظر آئے گی' میں یہ رقم تمہیں واپس لوٹا دوں گا۔"

رضوانہ نے کہا "مگر میں نے تو آپ کو یہ رقم بطور قرض نہیں دی تھی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "خیر' یہ بتائیں کہ کاروبار میں ایسی کون سی بہتری آگئی ہے؟"

"میں نے کہا نا' تم بہت لکی ہو۔" آفتاب عالم مسرور لہجے میں بولا "دو تین پارٹیوں کے پاس بڑی بڑی پے منٹس رکی ہوئی تھیں۔ پچھلے چھ دنوں میں ساری کلیئرنس ہو گئی ہیں اور ایک بہت بڑا کنٹریکٹ بھی ملا ہے۔"

"مبارک ہو' یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" رضوانہ نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ پھر نوٹوں والا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا "یہ آپ ہی رکھ لیں۔ میں بھلا اس کا کیا کروں گی۔"

آفتاب عالم نے یوں اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لئے جیسے رضوانہ نے کوئی خطرناک چیز اس کی سمت بڑھا دی ہو۔ پھر بے پروائی سے بولا "یہ رقم میرے پاس تمہاری امانت تھی۔ تم جیسے چاہو' اسے استعمال کرو۔ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دو یا زیورات بنوا لو' تمہاری مرضی ہے۔"

اس وقت رضوانہ کو آفتاب عالم دنیا کا عظیم ترین انسان نظر آرہا تھا۔ فوزیہ اور خلیق الزماں خوامخواہ اس کی جانب سے بدگمان تھے۔ وہ دل ہی دل میں ان دونوں کو صلواتیں سنانے لگی۔ اس دوران میں وہ محبت بھری نظروں سے آفتاب عالم کو بھی دیکھتی جا رہی تھی۔ آفتاب عالم اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

"کیا سوچنے لگیں تم؟" آفتاب عالم نے پوچھا۔

وہ چونک گئی "کچھ نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس رقم کو کہاں استعمال کروں۔"

"تم بھی خوامخواہ ہی پریشان ہو جاتی ہو" آفتاب عالم نے ملائمت سے کہا "تین لاکھ روپے بھی بھلا کوئی رقم ہوتی ہے' لوگ تو کھڑے کھڑے تین کروڑ روپے خرچ کر ڈالتے ہیں۔ پھر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ اسے خرچ ہی کیا جائے۔"

"تو پھر کیا کروں؟"

"بھئی اس رقم سے سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لو۔"

رضوانہ کو فوزیہ کا مشورہ یاد آیا۔ اس نے بھی سیونگ سرٹیفکیٹ خریدنے کی بات کی تھی۔ اسے ایک مرتبہ پھر خود پر ناز محسوس ہونے لگا کہ اسے اتنا مخلص اور ہمدرد شوہر ملا تھا۔ کتنا خیال تھا اسے رضوانہ کا اور اس کے مفاد کا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں سیونگ سرٹیفکیٹ ہی خریدوں گی۔"

آفتاب عالم نے کہا "تم کل میرے ساتھ ہی چلنا۔ پہلے ہم نیشنل سیونگ سنٹر چلیں گے۔ سرٹیفکیٹ خریدنے کے بعد میں تمہیں گھر ڈراپ کر کے آفس چلا جاؤں گا۔"

دوسرے روز حسب پروگرام رضوانہ نے تین لاکھ روپے کے سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لئے اور نامزدگی کے خانے میں آفتاب عالم کا نام لکھوا دیا۔ یہ بظاہر ایک معمولی سی بات تھی لیکن اس کے پس پردہ آفتاب عالم کا غیر معمولی منصوبہ آہستہ آہستہ پایۂ تکمیل کی جانب گامزن تھا۔

کچھ عرصے کے بعد آفتاب عالم نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اس نے اپنے اور رضوانہ کے نام سے ایک ڈبل بیمہ پالیسی خرید لی۔ یہ میاں بیوی کی مشترکہ پالیسی تھی جو آٹھ لاکھ روپے کی مالیت کی تھی۔ کسی ایک فرد کی حادثاتی موت کے نتیجے میں دوسرے فرد کو آٹھ لاکھ روپے کی رقم مل جاتی۔

پھر رفتہ رفتہ آفتاب عالم کے رویئے میں تبدیلی آنے لگی۔ اب ان کی شادی کو آٹھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ آئے دن ان کے درمیان معمولی نوعیت کی نوک جھونک ہونے لگی۔ رضوانہ نے صاف طور پر محسوس کیا کہ آفتاب عالم کے رویئے میں سردمہری کا عنصر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اسے کام کی زیادتی سمجھی کیونکہ آفتاب عالم اب رات گئے ہی دفتر سے لوٹتا تھا۔ پھر رضوانہ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ اس کا شوہر شراب بھی پیتا تھا۔ پیتا تو وہ عرصہ دراز سے تھا لیکن رضوانہ کے علم میں یہ بات اب آئی تھی۔

آہستہ آہستہ میاں بیوی میں کشیدگی بڑھنے لگی اور نوبت مارپیٹ تک جا پہنچی۔

ایک بات تھی کہ ہر بدمزگی کے بعد آفتاب عالم اپنے رویئے کی معافی مانگ لیتا تھا اور آئندہ ایسا نہ کرنے کی یقین دہانی بھی کرواتا تھا۔ رضوانہ مطمئن ہو جاتی۔

فوزیہ کو اپنی بہن کی ازدواجی زندگی کی اڑتی اڑتی تلخ خبریں تو ملتی رہتی تھیں لیکن رضوانہ نے کبھی اسے دل کا احوال نہیں سنایا تھا۔ رضوانہ نے ایک طرح سے اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ جانے کیوں؟ وہ آفتاب عالم کی ہر زیادتی برداشت کر کے بھی اس کے ساتھ رہنے پر خوش تھی۔ وہ اپنے شوہر سے سچی محبت کرتی تھی۔

اسی دوران میں خلیق الزماں کو کویت کی ایک آئل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ پہلے وہ خود کویت پہنچا' پھر کچھ ہی عرصے بعد اس نے بیوی اور بچوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ ان لوگوں کا رضوانہ سے رابطہ محض ٹیلی فون پر رہ گیا تھا اور وہ بھی کبھی کبھار۔ آفتاب عالم اپنے گھر میں ان کی آمد کو پسند نہیں کرتا تھا' اس لئے وہ خود ہی احتیاط کرتے تھے۔ یہی احتیاط انہوں نے ٹیلی فون کے سلسلے میں بھی ملحوظ رکھی ہوئی تھی۔

پندرہ فروری کو جب خلیق الزماں کو معلوم ہوا کہ گزشتہ سال چوبیس دسمبر کو رضوانہ چھت سے گر کر حادثاتی موت کا شکار ہو گئی تھی تو وہ اپنی بیوی فوزیہ اور بچوں کے ہمراہ فوراً یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کا خیال بلکہ یقین تھا کہ رضوانہ کو اس کے شوہر آفتاب عالم نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اپنے اس یقین کو سچ ثابت کرنے کے لئے اس نے بڑی تگ و دو بھی کی تھی اور اس کی "تگ و دو" کی بنا پر ہی میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز کوئی دو ماہ بعد ہوا۔ میرے استغاثے کے جواب میں آفتاب عالم نے اپنے وکیل کی مدد سے جواب دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ میں نے استغاثہ کے گواہوں میں چار افراد کے نام پیش کیے تھے۔ نمبر ایک خاکروب مائیکل جس نے سب سے پہلے رضوانہ کی لاش دیکھی تھی۔ نمبر دو دودھ والا محمد اسحاق جو مائیکل کے بعد سب سے پہلے وقوعہ پر پہنچا تھا۔ نمبر تین ملزم آفتاب عالم کا سامنے والا پڑوسی اشفاق حسین اور نمبر چار بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر رہنے والا سعید بخاری۔

جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔

استغاثہ کی جانب سے پہلا گواہ خاکروب مائیکل پیش ہوا۔ اس نے مقدس کتاب پر

سچ بولنے کا حلف اٹھایا' پھر بیان دیا "میں گزشتہ دو سال سے اس علاقے میں صفائی وغیرہ کا کام کر رہا ہوں۔ وقوعہ کے روز میں حسب معمول جب اس گلی میں پہنچا تو عین گلی کے بیچ میں کسی کو سوتے دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں جھاڑو لگاتے ہوئے جب ذرا قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حیرت دوچند ہو گئی کہ وہ کوئی عورت تھی۔ سردی کے موسم میں کسی عورت کو گلی میں سوتے دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا۔ میں ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دودھ والا اپنی سائیکل پر گلی میں داخل ہوا۔ میں نے آواز دے کر اسے اپنے پاس بلا لیا' پھر اس عورت کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی عورت کو دیکھ چکا تھا۔ نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ پہچان بھی چکا تھا۔ دودھ فروش محمد اسحاق نے مجھے بتایا کہ وہ عورت اس بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر رہتی تھی۔ ساتھ ہی اس نے بلڈنگ کی جانب اشارہ بھی کیا۔ ہم دونوں نے مل کر شور مچایا تو دائیں بائیں کی کھڑکیوں سے کچھ افراد جھانکنے لگے۔ اس کے فوراً بعد ہی دودھ والا اس بلڈنگ میں داخل ہو گیا جس جانب اس نے اشارہ کیا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس عورت کے گھر والوں کو اطلاع دینے جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس عورت کا شوہر آنکھیں ملتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ پھر اپنی بیوی کی لاش کو دیکھتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔"

مائیکل کا بیان ختم ہوا تو میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ میں نے پوچھا "مسٹر مائیکل! ابھی آپ نے معزز عدالت کو بیان دیتے ہوئے بتایا ہے کہ جب آپ وقوعہ کے روز حسب معمول صفائی کے لئے ملزم کی گلی میں داخل ہوئے تو آپ نے کسی کو گلی میں سوتے ہوئے دیکھا تھا۔ بعدازاں جب آپ اس کے قریب پہنچے تو انکشاف ہوا کہ وہ کوئی عورت تھی۔ کیا میں نے ٹھیک کہا ہے۔"

"جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا ہے۔" مائیکل نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"مسٹر مائیکل!" میں نے اگلا سوال کیا "آپ نے یہ بھی بیان دیا ہے کہ ملزم اطلاع ملنے پر آنکھیں ملتے ہوئے گلی میں پہنچا تھا اور اس نے اپنی بیوی کی لاش کو دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ عورت لاش میں تبدیل ہو چکی تھی؟"

مائیکل نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے آفتاب عالم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

جواب دیا "جناب' اس شخص نے روتے ہوئے خود ہی اس بات کا ذکر کیا تھا۔"

"کس بات کا؟"

"ملزم نے وہاں پہنچتے ہی واویلا مچانا شروع کر دیا تھا۔" مائیکل نے بتایا "یہ روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا.....بے وقوف میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا تھا کہ اتنی صبح چھت پر نہ جایا کرو۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک روز تمہیں ضرور کوئی حادثہ پیش آجائے گا.....اور بالآخر وہی ہوا۔ تم جان گنوا بیٹھی ہو۔"

میں نے پوچھا "مسٹر مائیکل۔ آپ نے ملزم کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ملزم کی بیوی رضوانہ کو گلی میں پڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کیا اس وقت آپ کو اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ مر چکی تھی؟"

"نہیں جناب' اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔" مائیکل نے جواب دیا۔ "بالکل ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی اطمینان سے کروٹ کے بل سو رہا ہو۔"

میں نے پوچھا "کیا آپ نے اس اطمینان سے لیٹی ہوئی عورت کے ارد گرد کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی؟"

"میں آپ کا سوال نہیں سمجھا۔"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے کہ کوئی خون وغیرہ......"

اس نے نفی میں جواب دیا "وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔"

میں نے پوچھا "اس عورت یعنی ملزم آفتاب عالم کی بیوی رضوانہ نے کس قسم کا جوتا پہن رکھا تھا؟"

"وہ پاؤں سے ننگی تھی۔"

"اس کے جسم پر کیسا لباس تھا؟"

مائیکل نے بتایا "وہ پھول دار شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔"

"اور ڈوپٹہ؟"

"ڈوپٹہ مجھے نظر نہیں آیا۔"

"اس کے علاوہ؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا "کیا اس نے موسم کی مناسبت سے کوئی سویٹر وغیرہ پہن رکھا تھا؟"

"نہیں جناب' بالکل نہیں۔"

میں نے معنی خیز نظروں سے جج کی جانب دیکھا "مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب۔" پھر میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد وکیل صفائی نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔ وہ گواہوں کے کٹہرے کے پاس پہنچا اور گواہ مائیکل سے سوال کیا۔

"مسٹر مائیکل' آپ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے گھر سے کس وقت نکلتے ہیں؟"

مائیکل نے جواب دیا "صبح پانچ بجے کے قریب۔"

"کیا آپ وقوعہ کے روز بھی پانچ بجے ہی گھر سے نکلے تھے؟"

"جی ہاں' کم و بیش یہی وقت تھا۔"

وکیل صفائی نے سوال کیا "آپ نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ جب آپ میرے موکل کی گلی میں داخل ہوئے تو آپ نے عین گلی کے وسط میں کسی کو لیٹے ہوئے دیکھا تھا؟"

"جی ہاں۔" مائیکل نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

"اور وہ چوبیس دسمبر کی صبح تھی؟"

"بالکل وہ چوبیس دسمبر کی ہی صبح تھی۔" مائیکل کے جواب میں قطعیت کی واضح جھلک تھی "اور اس روز منگل کا دن تھا۔ یہ دن اور تاریخ مجھے اس لئے بھی یاد رہ گئے ہیں کہ اس سے اگلے روز کرسمس تھا۔"

"بہت خوب۔" وکیل صفائی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "استغاثہ کے گواہ کی یادداشت کی داد دینا پڑے گی۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "میرے فاضل دوست معزز گواہ کا تمسخر اڑانے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔"

"میں نے کسی کا تمسخر نہیں اڑایا جناب عالی۔" وکیل صفائی نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بلکہ گواہ کی یادداشت کی داد دی ہے۔"

جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "آپ کو کس بات پر اعتراض ہے بیگ صاحب؟"

"مجھے بات پر نہیں' انداز پر اعتراض ہے یور آنر۔" میں نے نہایت ہی مودب لہجے میں کہا "میرے فاضل دوست گواہ کی یادداشت کی داد دیں لیکن داد کے انداز میں۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا "یور آنر' بعض اوقات ایک ہی لفظ اپنی ادائیگی کے سبب مختلف معنی دیتا ہے۔ مثلاً "شاباش" کا لفظ کسی کارنامے پر خراج تحسین پیش کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور کسی کوتاہی یا نالائقی کی مذمت کے لئے بھی۔ ہر دو صورت میں اس لفظ کی ادائیگی کا انداز جدا ہوگا۔ میرے فاضل دوست معزز گواہ کی یادداشت کو سراہ تو رہے ہیں لیکن ان کا انداز استہزائیہ ہے جو کسی بھی طور مناسب نہیں ہے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میرے فاضل دوست۔" وکیل صفائی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں آپ کے معزز گواہ کی عقل پر ماتم کر رہا ہوں۔"

اس کے انداز نے مجھے چراغ پا کر دیا' تاہم میں نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس اتنا کہا "لینگویج پلیز۔"

جج نے ہمیں آپس میں الجھتے ہوئے دیکھا تو کہا "عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے۔"

وکیل صفائی گواہ مائیکل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "مسٹر مائیکل' کیا آپ جانتے ہیں کہ دسمبر کے مہینے میں صبح پانچ بجے چار سو اندھیرا ہوتا ہے؟"

"جی ہاں' میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اس کے باوجود بھی آپ نے گلی کے وسط میں کسی کو لیٹے ہوئے دیکھ لیا تھا؟"

مائیکل نے تحمل سے جواب دیا "بالکل ایسا ہی ہوا تھا......اور اس کی دو وجوہات تھیں۔"

اب میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ وکیل صفائی کس بات پر اچھل کود مچا رہا تھا۔ میں نے اس کے غیر شائستہ رویئے کی بنا پر دل میں فیصلہ کر لیا کہ موقع ملنے پر میں اسے خوب رگڑوں گا۔

وکیل صفائی نے پوچھا "اور وہ وجوہات کیا تھیں؟"

"پہلی وجہ تو یہ تھی کہ مذکورہ گلی میں ہر الیکٹرک پول کے ساتھ اسٹریٹ لائٹ

موجود ہے۔" مائیکل کا جواب تسلی بخش تھا "اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر گلی میں اسٹریٹ لائٹ کی روشنی نہ بھی ہوتی تو میں بہ آسانی پوری گلی میں موجود چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وکیل صفائی نے طنزیہ انداز میں کہا "کیا آپ گھر سے اینٹی ڈارک آئی لینس لگا کر جھاڑو دینے نکلتے ہیں؟"

مائیکل نے متحمل لہجے میں جواب دیا "وکیل صاحب! اگر میں آپ کے سوال کے جواب میں یہ کہوں کہ..... آپ کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہ رہا ہے تو یہ توہین عدالت ہوگی۔ اس لئے میں ایسا کہنے سے گریز کروں گا۔"

وکیل صفائی بل کھا کر رہ گیا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے وکیل صفائی کو دیکھا۔ جج نے گواہ مائیکل کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا "آپ اس بات کی وضاحت کریں کہ اگر گلی میں اسٹریٹ لائٹ موجود نہ ہوتی تو پھر آپ کس طرح گلی میں موجود چیزوں کو دیکھ سکتے تھے؟"

"جناب عالی!" مائیکل نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "بات بہت معمولی سی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں بلاشبہ پانچ بجے ہی گھر سے نکلتا ہوں اور اس بات میں بھی کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہے کہ اس وقت اندھیرا ہوتا ہے لیکن میں صرف ایک گلی کی صفائی نہیں کرتا ہوں۔ میرے پاس خاصا بڑا علاقہ ہے۔ میں جب صفائی کرتے ہوئے وقوعہ والی گلی میں پہنچتا ہوں تو سپیدہ سحر نمودار ہو چکا ہوتا ہے یعنی اس وقت صبح کے تقریباً چھ بج چکے ہوتے ہیں۔" پھر اس نے وکیل صفائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا "ذہین وکیل صاحب یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ وقوعہ کے روز یعنی چوبیس دسمبر کو سورج کتنے بجے طلوع ہوا ہوگا!"

وکیل صفائی کھسیاہٹ میں بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے فقط مسکرانے پر اکتفا کیا۔ مائیکل جیسا پراعتماد اور عقل مند گواہ میری نظر سے پہلے نہیں گزرا تھا۔ اس نے اپنے مدلل جواب میں وکیل مخالف کو لاجواب کر دیا تھا۔

مائیکل کے بعد استغاثہ کا دوسرا گواہ دودھ فروش محمد اسحاق گواہی کے لئے پیش ہوا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد جو بیان دیا' وہ تقریباً مائیکل کے بیان

سے ملتا جلتا تھا۔ صفحات کی تنگی کے باعث میں اس کی تفصیل میں جانے کے بجائے براہ راست جرح کا حال بیان کرتا ہوں۔

میں نے محمد اسحاق سے پوچھا "اسحاق صاحب! آپ نے ابھی بیان دیا ہے کہ آپ نے رضوانہ کو گلی میں پڑے ہوئے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ کیا آپ اسے پہلے سے جانتے تھے؟"

محمد اسحاق کی عمر لگ بھگ بتیس سال تھی۔ وہ ایک گبرو جوان تھا۔ اپنے ڈیل ڈول سے وہ کوئی پہلوان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی وضع قطع سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی کرخت مزاج کا شخص ہوگا لیکن اپنے حلیے کے برعکس وہ خاصا شائستہ اور نرم خو تھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"جناب' میں مرحومہ کو تقریباً دو سال سے جانتا تھا۔"

"یعنی جب وہ اس بلڈنگ میں آئی تھیں؟"

"جی ہاں' بالکل۔" محمد اسحاق نے جواب دیا "پہلے آفتاب صاحب ایک لیٹر دودھ لیتے تھے' پھر جب ان کی شادی ہو گئی اور رضوانہ صاحبہ اس گھر میں آگئیں تو میں انہیں دو لیٹر دودھ دینے لگا تھا۔"

"آپ ملزم کو کب سے جانتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تین' ساڑھے تین سال سے۔"

میں نے استفسار کیا "آپ کتنے عرصے سے اس گلی میں دودھ سپلائی کر رہے ہیں؟"

اس نے بتایا "تقریباً آٹھ سال سے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے ملزم آپ سے دودھ نہیں لیتا تھا یعنی تین یا ساڑھے تین سال سے پہلے؟"

"جی ہاں' پہلے وہ اس گھر میں نہیں رہتا تھا بلکہ اس کی پہلی بیوی فیروزہ بیگم رہتی تھیں جو دودھ نہیں لیتی تھیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "کیا ملزم نے رضوانہ سے پہلے کسی اور عورت سے بھی شادی کر رکھی تھی؟"

”جی ہاں، فیروزہ بیگم ایک بیوہ خاتون تھیں۔“ محمد اسحاق نے بتایا ”وہ کافی عرصے سے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ پھر پتہ چلا کہ انہوں نے آفتاب عالم نامی ایک شخص سے شادی کرلی ہے۔ اس کے بعد ہی ملزم اس گھر میں آکر رہنے لگا تھا۔“

میں یہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا۔ گواہ محمدؐ اسحاق سے یہ سوالات پوچھنے کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ حقائق عدالت کے ریکارڈ پر آجائیں۔ میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ گواہ کے جوابات سن کر کٹہرے میں کھڑا ملزم آفتاب عالم بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

میں نے گواہ سے پوچھا ”آپ نے ابھی بتایا ہے کہ مرحومہ رضوانہ سے قبل ملزم کسی فیروزہ بیگم نامی خاتون کا شوہر رہ چکا ہے۔ فیروزہ بیگم کا کیا ہوا؟“

”اصل بات تو میں نہیں جانتا جناب لیکن سنا ہے کہ باورچی خانے میں کام کرتے ہوئے ان کے کپڑوں میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور وہ جل کر مرگئی تھیں۔“

اس کے بعد میں نے محمد اسحاق سے چند ایسے سوالات پوچھے جن سے گواہ مائیکل کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی، پھر میں اپنی مخصوص سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

میرے بعد وکیل صفائی جرح کے لئے آگے بڑھا لیکن دو چار رسمی اور غیر اہم سوالات کے بعد اس نے جرح موقوف کر دی۔ اس کے انداز سے بددلی ہویدا تھی۔ فوری طور پر یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ اس کی عدم دلچسپی کی وجہ کیا ہو سکتی تھی۔ اس کا سارا جوش و خروش اچانک جھاگ کے مانند بیٹھ گیا تھا۔ شاید یہ اس کی کوئی چال تھی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

منظر سیشن کورٹ کے اسی کمرے کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں استغاثہ کا گواہ اور ملزم آفتاب عالم کا پڑوسی اشفاق حسین کھڑا تھا۔

اشفاق حسین کی عمر چوالیس پینتالیس سال رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اشفاق حسین اس بلڈنگ میں گزشتہ بیس سال سے رہ رہا تھا۔ وہ ایک سلجھا ہوا اور بردبار شخص نظر آتا تھا۔

اشفاق حسین نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد نہایت ہی مختصر سا بیان دیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس کی نظر میں آفتاب عالم کوئی معقول شخص نہیں تھا۔ اس کے گھر سے اکثر و بیشتر لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی تھیں، خاص طور پر جب سے اس نے نئی شادی کی تھی۔ اس کے بعد سے اس گھر کی ہنگامہ آرائیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ اس نے ایک دو مرتبہ ملزم کے ضعیف والد مشرف حسین کو بھی اس سلسلے میں ٹوکا تھا جس نے ملزم کو سمجھانے کا وعدہ کیا تھا۔

اشفاق حسین کا بیان ختم ہوا تو میں سوالات کے لئے آگے بڑھا۔ میں نے پوچھا ”اشفاق حسین صاحب! ماشاء اللہ آپ اس بلڈنگ میں کافی عرصے سے رہ رہے ہیں۔ وہاں کے دیگر مکینوں کے بارے میں آپ کو خاصی معلومات ہوں گی؟“

”میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں جناب۔“ اشفاق حسین نے بتایا ”دوسروں کی ٹوہ میں رہنا مجھے پسند نہیں ہے۔ ہماری بلڈنگ میں زیادہ تر لوگ کرائے دار ہیں، اس لئے آتے جاتے رہتے ہیں۔“

میں نے کہا ”اشفاق صاحب! میں آنے جانے والے کرائے داروں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ آپ کی طرح کچھ اور لوگ بھی اس بلڈنگ میں اپنے ذاتی فلیٹوں میں رہتے ہیں اور سال ہا سال سے رہ رہے ہیں۔“

”ہاں ایسا تو ہے۔“

”اشفاق صاحب! ملزم آفتاب عالم آپ کا پڑوسی ہے۔ آپ دونوں کے فلیٹوں کے دروازے تقریباً آمنے سامنے ہیں۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ آپ کو سامنے والے فلیٹ سے اکثر لڑائی بھڑائی کی آوازیں آتی رہتی تھیں؟“

اشفاق حسین نے اثبات میں جواب دیا ”اکثر و بیشتر میں اس قسم کی آوازیں سنتا رہتا تھا اور خصوصاً رات میں بلکہ رات گئے کہیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔“

میں نے پوچھا ”کیا آپ رات کو دیر تک جاگنے کے عادی ہیں؟“

”آپ کا اندازہ درست ہے۔“ اس نے بتایا ”میں دراصل رات کو خاصی دیر تک دکان کھلی رکھتا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ طارق روڈ کی رونق رات گئے

تک برقرار رہتی ہے۔ میں کپڑے کی ایک دکان چلاتا ہوں۔"

میں نے پوچھا "اشفاق صاحب! ملزم آفتاب عالم کو آپ کے پڑوس میں آباد ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"یہی کوئی تین' ساڑھے تین سال۔"

"آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ خاص طور پر جب سے ملزم نے نئی شادی کی تھی' اس کے بعد سے اس گھر میں ہنگامہ آرائی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ملزم کی دوسری بیوی کوئی جھگڑالو عورت تھی؟"

"میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"پھر کیا مطلب تھا؟"

وہ بولا "درحقیقت بات یہ ہے کہ مرحومہ رضوانہ سے پہلے ملزم آفتاب عالم فیروزہ بیگم کا شوہر رہ چکا تھا۔ ان دونوں کی شادی لگ بھگ ایک سال تک رہی' پھر وہ حادثاتی موت کا شکار ہو گئیں۔ مرحومہ فیروزہ بیگم کا ہمارے ہاں آنا جانا بھی تھا' اس لئے ہمیں کافی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں لیکن رضوانہ کے سلسلے میں ملزم نے خاص طور پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اسے آس پڑوس میں جانے کی اجازت نہیں تھی' اس لئے میں کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ دونوں میاں بیوی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔"

اشفاق حسین نے خاصا الجھا ہوا جواب دیا تھا' میں نے ذرا مختلف زاویئے سے سوال کیا "اشفاق صاحب! آپ تو فیروزہ بیگم کے خاصے پرانے پڑوسی تھے اور آپ کے بقول' ان سے آپ کے گھریلو مراسم بھی تھے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فیروزہ بیگم نے ملزم آفتاب سے کن حالات میں شادی کی تھی؟"

وکیل صفائی نے فوراً مداخلت کی "مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔ میرے فاضل دوست ایک غیر متعلق موضوع کو بیچ میں لا کر خوامخواہ عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یور آنر! جو معاملہ اس وقت غیر متعلق نظر آرہا ہے' آگے چل کر وہ انتہائی متعلق ہو جائے گا۔ اس لئے معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ وکیل

صفائی کو میری جرح میں مداخلت سے باز رکھے۔"

وکیل صفائی نے کہا "جناب عالی! وکیل استغاثہ کو اپنے استغاثے تک محدود رہنا چاہئے۔ میرے موکل کے ماضی کو کرید کر وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "بیگ صاحب! آپ اپنے سوالات کو مرحومہ رضوانہ اور ملزم آفتاب عالم تک محدود رکھیں۔"

"آل رائٹ یور آنر۔" میں نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر نہایت ہی مودبانہ لہجے میں کہا' پھر اشفاق حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"اشفاق صاحب! میں نے جج کی ہدایت کے مطابق سوال کیا "آپ کا بیان ہے کہ ملزم کے گھر سے اکثر لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ کیا وقوعہ کی رات بھی آپ نے اس نوعیت کی کچھ آوازیں سنی تھیں؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے وقوعہ کی رات ایسی آوازیں سنی تھیں۔"

اشفاق حسین نے جواب دیا "اس رات میرے سر میں درد تھا اور میں بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وقوعہ کی رات ملزم خاصی دیر سے گھر آیا تھا' تقریباً دو بجے کے بعد۔ اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد ہی میاں بیوی میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔"

"دیٹس آل یور آنر۔" میں جرح ختم کرکے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وکیل صفائی نے گواہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "اشفاق حسین صاحب! کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے کہ دوسرے کے گھر کی باتیں سننا سنگین ترین اخلاقی جرم ہے؟"

"جی ہاں' میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اس کے باوجود بھی آپ اپنے پڑوسی کے اندرون خانہ لڑائی جھگڑے کو بڑی توجہ سے سنتے رہے ہیں۔"

اشفاق حسین نے بااعتماد لہجے میں کہا "وکیل صاحب لگتا ہے آپ نے میرے جوابات پر غور نہیں کیا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے باری باری پہلے جج کو اور پھر مجھے دیکھا' اس کے بعد وکیل صفائی کی جانب مڑتے ہوئے کہا "وکیل صاحب! میں نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ میں خاص طور پر کان لگا کر اپنے پڑوسی کے گھر کے جھگڑے کو

سنا کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لڑائی جھگڑے کی آوازیں خودبخود میرے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ اس میں میری مرضی کو دخل نہیں تھا' اس لئے میں کسی اخلاقی جرم کا مرتکب نہیں ہوا ہوں۔"

وکیل صفائی نے پوچھا "اشفاق صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات میرا موکل دو بجے کے بعد گھر لوٹا تھا اور آتے ہی اس نے اپنی بیوی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا تھا۔ آپ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں نہ تو کچھ ثابت کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی کچھ جھٹلانا چاہتا ہوں۔" اشفاق حسین نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "یہ کام آپ وکیل صاحبان کا ہے۔ میں تو بس اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔ آپ لوگ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے' میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کے سوال کا درست جواب دوں گا۔"

وکیل صفائی نے دو تین مزید سوالات پوچھ کر جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد استغاثہ کا چوتھا اور آخری گواہ سعید بخاری پیش ہوا۔ سعید بخاری کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس چھتیس کے درمیان لگایا۔ وہ مذکورہ بلڈنگ کے فرسٹ فلور کے ایک فلیٹ کا رہائشی تھا اور کرائے دار تھا۔ وہ اکہرے بدن کا مالک ایک منحنی سا شخص تھا۔ اس نے بھاری مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں جو اس کے سوکھے چہرے پر پچکے ہوئے گالوں پر بوجھ محسوس ہوتی تھیں۔

سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے بڑا سنسنی خیز بیان دیا جس کا سب سے اہم حصہ یہ تھا کہ وقوعہ کی شب پچھلے پہر اس نے ملزم آفتاب عالم کو اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ واپس سیکنڈ فلور پر اپنے فلیٹ میں چلا گیا تھا۔

میں نے اس گواہ پر نہایت مختصر سی جرح کی۔ میں نے پوچھا "سعید بخاری صاحب! کیا آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وقوعہ کی رات پچھلے پہر آپ نے جس شخص کو اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا' وہ ملزم آفتاب عالم ہی تھا؟"

سعید بخاری نے جواب دیا "میں یہ بات اتنے ہی وثوق سے کہہ سکتا ہوں جتنے وثوق سے یہ کہ میں اس وقت سٹی کورٹ کے ایک کمرے میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑے وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔"

میں نے پوچھا "بخاری صاحب! ذرا سوچ کر بتائیں۔ جب آپ نے ملزم کو اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تو اس وقت اس کے ساتھ اور کون تھا؟"

"ملزم اکیلا ہی تھا اور اس نے کندھے پر کچھ اٹھا رکھا تھا۔"

"وقت کیا ہوگا؟"

وہ کچھ سوچ کر بولا "یہی کوئی پانچ' سوا پانچ بجے ہوں گے۔ ابھی فجر کی اذانیں نہیں ہوئی تھیں۔"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی۔" میں نے اپنی جرح ختم کر دی۔

وکیل صفائی پیچ و تاب کھاتے ہوئے سعید بخاری کے کٹہرے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ کچھ دیر تو تک تو کینہ توز نظروں سے اسے گھورتا رہا' پھر زہریلے لہجے میں سوال کیا۔

"بخاری صاحب! آپ نے جھوٹ بولنے کی کیا قیمت وصول کی ہے؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" میں نے وکیل صفائی کے سوال پر احتجاجی لہجے میں کہا "وکیل مخالف معزز گواہ پر رشوت کا الزام عاید کر رہے ہیں۔"

"یہ الزام نہیں' حقیقت ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے طیش کے عالم میں کہا "کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟"

"سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ گواہ کی گواہی معتبر نہیں ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے۔ منشیات فروشی اس کا پیشہ ہے۔"

"یہ سراسر بہتان تراشی ہے۔" میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "عدالت مفروضوں پر یقین نہیں کرتی۔ اپنی بات کی سچائی کے لئے ٹھوس ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔"

"وکیل صاحب!" جج نے وکیل صفائی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "آپ کے پاس

اپنے موقف کا کوئی ٹھوس ثبوت یا مدلل جواب ہے۔ کیا آپ عدالت میں یہ بات ثابت کر سکتے ہیں کہ سعید بخاری گواہ کے معیار پر پورا نہیں اترتا؟"

"جناب عالی....." وکیل صفائی نے اٹکتے ہوئے جواب دیا "وہ بات دراصل یہ ہے کہ گواہ میرے موکل کا دشمن ہے' اس لئے اس کے خلاف گواہی دے رہا ہے۔"

"اس دشمنی کی نوعیت کیا ہے؟" جج نے استفسار کیا۔

"گواہ منشیات فروش ہے۔ میرے موکل نے اسے اس دھندے سے باز رہنے کی تلقین کی تھی' اس لئے وہ میرے موکل کا دشمن ہو گیا۔"

"آپ کیا کہتے ہیں بیگ صاحب؟" جج نے میری جانب دیکھا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ میرے فاضل دوست کے دعوے کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔"

"وہ کس طرح؟" جج نے پوچھا۔

"وہ اس طرح جناب عالی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "کہ مذکورہ بلڈنگ کے تین چار مکین اس وقت عدالت میں موجود ہیں۔ معزز گواہ کے بارے میں ان کی رائے لی جا سکتی ہے۔"

جج کو میری تجویز پسند آئی' چنانچہ یہی کیا گیا۔ فیصلہ سعید بخاری کے حق میں ہوا۔ جج نے سوالیہ نظروں سے وکیل صفائی کو دیکھا "اب آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا گواہ کے معزز ہونے میں اب بھی آپ کو کوئی شبہ ہے؟"

وہ بدستور اپنی ڈھٹائی پر قائم رہا "ممکن ہے' یہ لوگ گواہ کی اصلیت سے واقف نہ ہوں!"

"لگتا ہے وکیل صفائی کے پاس پوچھنے کے لئے کچھ نہیں بچا۔" میں نے بروقت چوٹ کی "اسی لئے وہ فضول باتوں میں الجھ کر معزز عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

وکیل صفائی نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا۔ جج نے کہا "وکیل صاحب! آپ گواہ سے کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں؟"

وکیل صفائی' سعید بخاری کی جانب متوجہ ہوگیا "سعید صاحب! آپ نے اپنے

وکیل کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ قبل از اذان فجر' آپ نے اپنے دروازے کے سامنے سے وقوعہ کی رات میرے موکل کو گزرتے ہوئے دیکھا تھا جس نے اپنے کندھے پر کچھ اٹھا رکھا تھا؟"

"بالکل درست' میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

"کیا آپ اس بات کی وضاحت کریں گے کہ میرے موکل نے اپنے کندھے پر کیا اٹھا رکھا تھا؟"

"میں اس سلسلے میں معذرت خواہ ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نے وہ سارا منظر اپنے دروازے کے آئی گلاس کی مدد سے دیکھا تھا۔" سعید بخاری نے جواب دیا "میں پوری وضاحت کے ساتھ نہیں دیکھ سکا تھا۔"

"آپ اس وقت دروازے کے آئی گلاس سے آنکھ لگائے کس قسم کی کارروائی میں مصروف تھے؟"

سعید بخاری نے عام سے لہجے میں جواب دیا "کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہماری گلی میں اکثر رات گئے تک اوباش قسم کے لڑکے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں اور مختلف قسم کی شرارتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ وقوعہ کی رات کوئی منچلا میری ڈور بیل پر طبع آزمائی کر رہا تھا۔ وقفے وقفے سے بیل بجتی' میں اٹھ کر دیکھتا لیکن دروازے پر کسی کو نہ پاتا۔ اسی کوفت میں رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ آخر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے سوچا' کیوں نہ میں آئی گلاس سے آنکھ لگا کر واچ کروں۔ کم از کم اس طرح یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ نابنجار ہے کون۔ میرا ارادہ تھا کہ میں دوسری صبح اس شرارت زادے کو پیار سے سمجھاؤں گا۔ میں اسی خبیث کے انتظار میں تھا کہ میں نے ملزم کو کندھے پر کچھ اٹھائے ہوئے گزرتے دیکھا' ایک منٹ سے بھی پہلے وہ واپس لوٹ گیا اور واپسی کے وقت اس کا کندھا خالی تھا۔"

میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ جج پوری دلچسپی سے سعید بخاری کے انکشافات سن رہا تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جو نکتہ میں جج کے علم میں لانا چاہتا تھا' وہ واضح ہو چکا تھا۔

وکیل صفائی نے جرح ختم کی تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یور آنر! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس واقعے کے سابق انکوائری آفیسر سرفراز شاہ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یور آر پرمیٹیڈ۔" جج نے اجازت دے دی۔

آئی او سرفراز شاہ کٹہرے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر لگ بھگ ستائیس سال تھی۔ وہ صحت مند جسم کا مالک ایک خوش شکل شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی موجود تھی۔ پولیس کی وردی اس کے بدن پر خوب جچ رہی تھی۔

میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا "سرفراز شاہ صاحب! اگر میں آپ کو صرف شاہ جی کہہ کر مخاطب کروں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

وہ زیر لب مسکرایا "مجھے سب "شاہ جی" ہی کہتے ہیں۔ آپ بھی کہہ لیں جناب۔"

میں نے کہا "شاہ جی، چوبیس دسمبر کی صبح مرحومہ رضوانہ کے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا، آپ اس واقعے کے تفتیشی افسر تھے۔ غالباً وقوعہ کا نقشہ بھی آپ ہی نے تیار کیا تھا؟"

"جی ہاں، مشیر نامہ وغیرہ میں نے ہی تیار کیا تھا۔"

میں نے پوچھا "شاہ جی، آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

اس نے جواب دیا "اس وقت آٹھ بجنے والے تھے۔"

"جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو مرحومہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی؟"

"جی ہاں، میں نے اسے دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔" اس نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا "شاہ جی، کیا یہ سچ ہے کہ مرحومہ رضوانہ کے پاؤں میں جوتا نام کی کوئی چیز نہیں تھی؟"

اس نے مضطرب نظروں سے مجھے دیکھا، میں نے تنبیہی لہجے میں کہا "شاہ جی، ہر سوال کا جواب اچھی طرح سوچ سمجھ کر دیجئے گا کیونکہ آپ نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا تھا۔ ابھی تک وہ تفصیلات آپ کے ذہن اور پولیس کے کاغذات میں موجود

ہوں گی۔"

چند لمحے کی سوچ بچار کے بعد اس نے جواب دیا "ہاں، یہ سچ ہے کہ مرحومہ اس وقت پاؤں سے ننگی تھی۔"

"اور اس کے سر یا گردن وغیرہ میں دوپٹہ بھی نہیں تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "جی ہاں، دوپٹہ بھی نہیں تھا۔"

"کوئی سویٹر وغیرہ؟"

"ایسی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔"

میں نے اگلا سوال کیا "مرحومہ رضوانہ کی لاش گلی کے وسط میں اس طرح پڑی تھی جیسے وہ کروٹ کے بل سو رہی ہو؟"

"جی ہاں، وہ اسی پوزیشن میں تھی۔"

"کیا اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش ہے کہ یہ واقعہ چوبیس دسمبر کی صبح پیش آیا تھا؟"

"نہیں، شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" وہ خاصا الجھ چکا تھا۔ "پولیس کے ریکارڈ پر دن اور تاریخ درج ہے۔"

میں نے ذرا مختلف زاویئے سے سوال کیا "شاہ جی، آپ جس وقت جائے وقوعہ پر پہنچے، کس قسم کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھے؟"

وہ میرا سوال سن کر گڑبڑا گیا، پھر سرسری سے لہجے میں جواب دیا "ظاہر ہے، میں اپنی وردی پہنے ہوئے تھا۔"

"کیا اس وردی میں سویٹر بھی شامل تھا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا "اس روز اچھی خاصی سردی رہی تھی۔" اپنی بات ختم کرتے ہی وہ چونک گیا، پھر ہراساں نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی سنگین غلطی کر چکا ہو۔

میں نے اس کو سوچنے کا موقع دیئے بغیر سوال کیا "شاہ جی، پولیس رپورٹ کے مطابق یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ مرحومہ رضوانہ اپنے فلیٹ کی چھت پر سے نیچے گر کر ہلاک ہو گئی تھیں؟"

"اس میں کیا شک ہے؟" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "شاہ جی، آپ کو معلوم ہے کہ مرحومہ رضوانہ کا فلیٹ بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر تھا؟"

اس نے پریشانی سے مجھے دیکھا "جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔"

میں نے جج کی طرف مڑتے ہوئے کہا "یور آنر! کسی بلڈنگ کے سیکنڈ فلور کی چھت سے زمین کا فاصلہ اتنا کم بھی نہیں ہوتا کہ وہاں سے گرنے والے کو خراش تک نہ آئے جبکہ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مرحومہ کے سر میں صرف ایک چوٹ کا نشان تھا۔ حالانکہ اتنی بلندی سے گر کر تو ان کی ہڈیوں کا سرمہ بن جانا چاہئے تھا، ان کی کھوپڑی کا پاش پاش ہو جانا بھی بعید از امکان نہیں تھا لیکن وہاں تو صورتحال یہ تھی کہ مرحومہ کی کلائی میں موجود کانچ کی چوڑیاں بھی محفوظ رہیں۔"

اچانک وکیل صفائی بیچ میں کود پڑا "مجھے اعتراض ہے جناب عالی! وکیل استغاثہ تو چوڑیوں کا ذکر اس طرح کر رہے ہیں جیسے یہ خود موقع پر موجود تھے۔"

"میں موقع پر موجود نہ سہی لیکن میرے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں جو میرے بیان کی سچائی کے لئے کافی ہوں گے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایسے کون سے ثبوت ہیں آپ کے پاس؟"

"میرے محترم، آپ خوامخواہ اپنی توانائی ضائع نہ کریں۔" میں نے ناصحانہ انداز میں کہا "وقت آنے پر میں وہ ثبوت بھی معزز عدالت میں پیش کر دوں گا۔ فی الحال آپ خاطر جمع رکھیں اور عدالتی کارروائی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔" پھر میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "یور آنر! عدالت کا وقت ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ میں آج ہی تفتیشی افسر سرفراز شاہ صاحب پر اپنی جرح مکمل کر لوں۔"

جج نے وکیل صفائی کو مداخلت سے باز رہنے کی تاکید کی اور مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے تفتیشی افسر سے سوال کیا۔

"شاہ جی، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی سیکنڈ فلور کی چھت سے نیچے گلی میں گرے اور اس کے جسم پر خراش تک نہ آئے، اس کی ہڈی پسلی سلامت رہے اور اس کی کلائی

میں موجود کانچ کی چوڑیاں تک محفوظ رہیں؟"

اس نے جاہلانہ انداز میں جواب دیا "مرحومہ رضوانہ کو بھی اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں مگر وہ سب اندرونی چوٹیں تھیں......اور یہ کہ معجزے بھی تو ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر اس کی چوڑیاں نہیں ٹوٹ سکیں تو اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ تفتیشی افسر خاصا نروس ہو رہا تھا۔ جج پوری توجہ سے اس کے جواب سن رہا تھا اور اہم پوائنٹس بھی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔

میں نے کہا "شاہ جی، چلیں میں آپ کی بات سے اتفاق کر لیتا ہوں۔ مرحومہ کی کلائی میں موجود چوڑیاں معجزاتی طور پر ٹوٹنے سے محفوظ رہیں لیکن آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ اسے اچھی خاصی اندرونی چوٹیں بھی آئی تھیں۔ کیا آپ نے لاش کا پوسٹ مارٹم کروایا تھا؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا "لاش کا پوسٹ مارٹم تو نہیں ہوا تھا۔" اس نے گھبراہٹ آمیز انداز میں جواب دیا۔

"کیوں؟"

"ہم نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں سوال کیا "شاہ جی، آپ نے قتل کی ایک واردات کو حادثے کا رنگ دینے کے لئے ملزم آفتاب عالم سے کتنی رشوت وصول کی تھی؟"

"یہ جھوٹ ہے۔" اس کے لہجے میں کمزور سا احتجاج تھا۔ "ہم نے کسی سے کوئی رشوت نہیں لی۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ ملزم کو مرحومہ کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے کی ایک موٹی رقم وصول کی گئی تھی؟"

وکیل صفائی نے اعتراض جڑ دیا "بیگ صاحب! آپ کے پاس کوئی ایسا ثبوت موجود ہے کہ میرے موکل نے پولیس کو کوئی بھاری رقم بطور رشوت دی ہو؟"

میں نے تمسخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "میرے فاضل دوست، رشوت

ثبوت کے ساتھ لی اور دی نہیں جاتی۔ یہ بات تو آپ بھی بخوبی جانتے ہوں گے۔"

جج نے مجھے ہدایت کی "بیگ صاحب! آپ اپنے سوالات میں سے رشوت کا ذکر حذف کر کے جرح جاری رکھیں۔"

میں نے جج کی ہدایت کے بموجب اے ایس آئی سرفراز شاہ سے سوال کیا "شاہ جی' آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو آپ نے سرکاری وردی کے اوپر سویٹر بھی پہن رکھا تھا۔ وجہ آپ نے یہ بتائی کہ مذکورہ روز اچھی خاصی سردی ہو رہی تھی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

وہ کمزور سی آواز میں بولا "میں نے یہی جواب دیا تھا۔"

میں نے پوچھا "آپ نے اس بات کی بھی تصدیق کی ہے کہ جائے وقوعہ پر ملنے والی مرحومہ رضوانہ کی لاش کے پاس سینڈل' دوپٹہ یا کوئی سویٹر وغیرہ نہیں پایا گیا تھا؟"

"ہاں' ایسی کوئی چیز وہاں نہیں پائی گئی تھی۔"

"شاہ جی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ جس موسم میں آپ جیسا صحت مند انسان گرم وردی کے اوپر سویٹر اور پاؤں میں لانگ بوٹ پہنے ہوئے تھا' اسی موسم میں ایک کمزور عورت اپنے فلیٹ کی چھت پر ننگے سر اور ننگے پاؤں صرف ایک پھول دار شلوار قمیص میں کس طرح چلی گئی؟ آپ کی عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے؟"

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا "یہ تو آپ اسی سے جا کر پوچھیں۔"

"تھینک یو اسسٹنٹ سب انسپکٹر صاحب۔" میں نے تشکر آمیز نظروں سے سرفراز شاہ کو دیکھا۔ اس وقت میرے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

وہ سٹپٹا گیا "آپ کس بات کا شکریہ ادا کر رہے ہیں؟"

"آپ کے زریں مشورے کا۔" میں بدستور مسکرا رہا تھا۔

"میں سمجھا نہیں!" اس کی حیرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

میں نے کہا "شاہ جی' آپ کے حکم کے مطابق اب میں ہر بات مرحومہ ہی سے پوچھوں گا۔"

اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ لکنت آمیز لہجے

میں سوال کیا "مرحومہ آپ کے سوالات کا جواب کیسے دے گی؟"

"میں اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کراؤں گا!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے نئی تاریخ دے کر عدالتی کارروائی ملتوی کر دی۔ آج کی سماعت خاصی سود مند ثابت ہوئی تھی۔ خلیق الزماں اور فوزیہ میری کارکردگی سے مطمئن تھے۔

ایک بات کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گیا اور وہ یہ کہ میرے استغاثے کے جواب میں ملزم آفتاب عالم نے اپنے وکیل کی مدد سے جو جواب دعویٰ دائر کیا تھا' اس میں بتایا گیا تھا کہ مرحومہ رضوانہ حادثاتی موت کا شکار ہوئی تھی۔ وقوعہ کے روز وہ چھت پر کبوتروں کے لئے باجرہ اور پانی رکھنے گئی تھی کہ اچانک پاؤں پھسل جانے سے وہ نیچے آگری اور موت سے ہمکنار ہو گئی۔

پولیس نے اس کیس کی فائل کو داخل دفتر کرنے سے پہلے جو سرسری سی رپورٹ تیار کی تھی' وہ بھی اس سے ملتی جلتی تھی۔ ملزم آفتاب عالم اور پولیس والوں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ کبھی اچانک لاش کا پوسٹ مارٹم بھی کروایا جا سکتا ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق آفتاب عالم نے کلیم ڈیپارٹمنٹ کے مطالبے پر پولیس کو پچاس ہزار روپے کی بھاری رشوت دے کر مرحومہ کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا' تاہم ابھی اسے کلیم کی رقم نہیں ملی تھی اور وہ عدالت میں گھسیٹ لیا گیا تھا۔ البتہ تین لاکھ روپے مالیت کے سیونگ سرٹیفکیٹ وہ کیش کروا چکا تھا۔

آئندہ دو پیشیوں پر کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں ہوئی۔ ملزم کی صفائی میں اس کے والدین کا بھی بیان ہوا تھا جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

ملزم کے والد مشرف حسین نے بیان دیتے ہوئے بتایا تھا کہ جس وقت یہ حادثہ پیش آیا' وہ گھر میں موجود نہیں تھا۔ نماز فجر کے لئے وہ قبل از اذان ہی گھر سے نکل جاتا تھا۔ جب وہ مسجد سے واپس لوٹا تو گلی میں جم غفیر کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ بعدازاں اسے معلوم ہوا کہ اس کی بہو چھت سے گر گئی تھی۔

مشرف حسین کی بیوی حسینہ بیگم نے بیٹے کی پردہ پوشی کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق جب وہ نماز فجر ادا کر رہی تھی تو اس نے اپنی بہو کو

چھت کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت ملزم آفتاب عالم اپنے کمرے میں سو رہا تھا اور مشرف حسین حسب معمول مسجد میں تھے۔ حسینہ بیگم نماز سے فارغ ہونے کیبعد دینی کتب کے مطالعے میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد باہر سے ایک شور اٹھا' پھر پتہ چلا کہ اس کی بہو رضوانہ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ وہ چھت سے گر کر جاں بحق ہو گئی تھی۔

میں نے جرح کے سلسلے کو مزید آگے بڑھانے سے پیشتر ایک نہایت ہی اہم کام کر لینا ضروری سمجھا۔ میں نے اپنی فائل میں سے ایک اخبار نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! یہ اس شہر سے شائع ہونے والے ایک کثیر الاشاعت اخبار کی ایک کاپی ہے جو پچیس دسمبر کو شائع ہوا تھا۔ اس میں مرحومہ رضوانہ کو پیش آنے والے حادثے کی تفصیلات موجود ہیں اور مرحومہ کی تصویر بھی دی گئی ہے۔"

جج نے میرے ہاتھ سے اخبار لے کر نشان زدہ حصے کا سرسری جائزہ لیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! اگرچہ کسی اخبار کے تراشے یا خبر کو عدالت میں پیش کرنے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے لیکن میں ایک خاص امر کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔"

جج خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی فائل میں سے ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹوگراف برآمد کر کے جج کی جانب بڑھا دیا اور کہا "جناب عالی! یہ فوٹوگراف متعلقہ اخبار کے دفتر ہی سے حاصل کیا گیا ہے اور یہ وہی فوٹوگراف ہے جس کی فلم اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ چونکہ فوٹوگراف میں مرحومہ کی تصویر زیادہ واضح ہے' اس لئے میں یہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔"

میں نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہنا شروع کیا "جناب عالی! اس فوٹوگراف میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات نظر آ رہی ہے کہ مرحومہ کے جسم پر ایک پھول دار شلوار قمیص کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ جوتے' نہ دوپٹہ اور نہ ہی کوئی سویٹر وغیرہ۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہے اور معزز عدالت کی توجہ کی متقاضی بھی۔

علاوہ ازیں' مرحومہ کی کلائی میں موجود چوڑیاں بھی کوئی دوسری ہی کہانی بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر لاش جس انداز میں زمین پر پڑی ہے' وہ بھی قابل غور ہے۔ کم از کم چھت سے گرنے والا کوئی شخص اس پوزیشن میں نیچے نہیں آسکتا۔

یور آنر! میں نے معزز عدالت کی توجہ جن امور کی جانب مبذول کرائی ہے' اس کی تصدیق گواہ مائیکل اور انکوائری آفیسر سرفراز شاہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ساری باتیں عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔

"جناب عالی! ان واقعات اور شواہد کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرحومہ رضوانہ کی موت چھت سے گرنے کے باعث واقع نہیں ہوئی۔ اس کی موت کسی اور جگہ واقع ہوئی ہے اور بعدازاں اس کی لاش کو گلی میں ڈال دیا گیا ہے تاکہ یہ ایک حادثاتی موت ظاہر ہو جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔"

میں نے ایک لمحے کو رک کر حاضرین عدالت کے چہروں کا جائزہ لیا' پھر جج کی جانب مڑتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا "یور آنر! حقیقت یہ ہے کہ مرحومہ رضوانہ کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئی بلکہ اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے......اور اس کا قاتل......اس کا شوہر آفتاب عالم ہی ہے۔"

عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے کو وکیل صفائی کی چیخ نما آواز نے توڑا "آئی آبجیکٹ یور آنر۔" وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا "میرے فاضل دوست حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ میرا موکل انتہائی معصوم اور بے گناہ انسان ہے۔ وہ اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "میرے فاضل دوست میں آپ کے اس معصوم موکل کی "معصومیت" کو راز نہیں رہنے دوں گا۔ اس معصوم نے ماضی میں بھی اپنی معصومیت کا اچھا خاصا مظاہرہ کیا تھا جب فیروزہ بیگم کچن میں جل کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔"

وکیل صفائی کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے کچا ہی چبا ڈالتا۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے جج کو مخاطب کیا۔

"جناب عالی! معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد مرحومہ

رضوانہ کی لاش کے پوسٹ مارٹم کے احکامات جاری کرے تاکہ اس کی موت کا وقت اور سبب معلوم ہو سکے۔"

انکوائری آفیسر نے کمزور سا احتجاج کیا "جناب عالی! اب تو قبر میں شاید اس کی ہڈیاں ہی بچی ہوں۔"

میں نے کہا "آئی او صاحب! یہ ہڈیاں بہت کام کی چیز ہوتی ہیں۔ شاید میڈیکل اور پوسٹ مارٹم کے بارے میں آپ نے کبھی معلومات حاصل کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی ورنہ یہ بات نہ کہتے۔ یہ ہڈیاں جو بظاہر معمولی سی نظر آتی ہیں' لیبارٹری تجزیئے کے دوران میں پکار اٹھتی ہیں کہ ......کچھ سمجھ میں آئی بات؟" میں نے سرفراز شاہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے تاثرات ابھر آئے۔

جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو ہدایت کی کہ جلد از جلد مرحومہ کے پوسٹ مارٹم کے انتظامات کیے جائیں۔ پھر عدالتی کارروائی کو جاری رکھتے ہوئے مجھ سے کہا "بیگ صاحب! کیا آپ ملزم پر جرح پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد کریں گے؟"

میں نے کہا "یہی مناسب رہے گا یور آنر۔"

پھر عدالت برخاست ہو گئی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ خاصی سنسنی خیز تھی۔

اس رپورٹ کی رو سے مرحومہ رضوانہ کی موت چوبیس دسمبر کی صبح دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب سر کے پچھلے حصے میں لگنے والی وہ چوٹ تھی جو کسی نوکدار ٹھوس چیز سے ٹکراؤ کے نتیجے میں لگی تھی۔ وہ کسی سخت چیز کا کنارہ بھی ہو سکتا تھا۔ میڈیکل ایگزامنر کے انکشاف نے آفتاب عالم اور اس کے خیرخواہوں کے جھوٹ کی قلعی کھول دی تھی لیکن اس موقع پر ملزم آفتاب عالم نے عجیب و غریب رویئے کا مظاہرہ کیا۔

میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کے لئے اس کٹہرے کی جانب بڑھا جس میں ملزم آفتاب عالم کھڑا تھا۔ میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"آفتاب عالم' پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

وہ بیزاری سے بولا "میں اس سلسلے میں کسی خیال آرائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

"مسٹر آفتاب عالم!" جج نے اسے سرزنش کی "وکیل صاحب کی بات کا سیدھا جواب دو۔"

وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا "آفتاب عالم' آپ کی بیوی کی موت چوبیس دسمبر کی صبح دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟"

"میں اس وقت سو رہا تھا۔" اس نے جواب دیا "اس لئے اتفاق کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے اس کی ڈھٹائی کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا "آپ نے استغاثہ کے جواب میں جو لمبا چوڑا بیان دیا ہے' وہ عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اس کے مطابق آپ نے کہا تھا کہ آپ کی بیوی علی الصبح کبوتروں کا باجرہ اور پانی رکھنے چھت پر گئی تھی کہ پاؤں پھسل جانے سے وہ نیچے آن گری۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "اب آپ بیان دے رہے ہیں کہ آپ اس وقت سو رہے تھے۔ آپ کی کونسی بات کو درست مانا جائے؟"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل صفائی اپنے موکل کی مدد کو دوڑا۔ "میرے موکل نے یہ کہا ہے کہ وہ دو اور تین بجے کے درمیان سو رہا تھا' یہ نہیں کہا کہ وہ علی الصبح سو رہا تھا۔ میرے فاضل دوست' علی الصبح کا مطلب ہے کہ کم و بیش صبح چھ بجے کا وقت بمطابق چوبیس دسمبر۔"

"تھینک یو مائی ڈیر کونسلر۔" میں نے چہرے پر مصنوعی تشکر کے جذبات سجاتے ہوئے کہا' پھر آفتاب عالم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"آفتاب عالم' آپ وقوعہ کی صبح دو اور تین بجے کے درمیان سو رہے تھے۔ یہی وقت ہے جب آپ کی بیوی سر میں لگنے والی شدید چوٹ کے سبب اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ ظاہر ہے' آپ تو اس وقت سو رہے تھے' اس لئے اس بارے میں کچھ نہیں جانتے ہوں گے مگر آپ کا کہنا یہ بھی ہے کہ آپ کی بیوی علی الصبح چھت سے

پھسل کر گلی میں آن گری تھی۔ کوئی مردہ کس طرح چھت پر جا کر کبوتروں کے دانے پانی کا انتظام کر سکتا ہے۔ ذرا اس کی وضاحت کریں گے؟"

وہ بری طرح الجھ چکا تھا' جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا "آپ ایک ہی بات گھما پھرا کر پوچھ رہے ہیں۔"

"آپ جواب دینے میں کوئی حرج محسوس کرتے ہیں؟"

"بس میں نے کہہ دیا نا کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تھا' اس وقت میں گہری نیند میں تھا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے عدالت کو بیان دیتے وقت دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔"

"یہ بات مجھے میری والدہ نے بتائی تھی کہ رضوانہ کبوتروں کے لئے دانہ پانی رکھنے چھت پر گئی تھی۔" وہ جزبز ہو کر بولا "میں نے خود اسے اپنی آنکھوں سے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔"

میں نے کہا "آپ کی والدہ نے اپنے بیان میں بھی یہ بات بتائی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس انسان کی موت دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہو چکی ہو' وہ چھ بجے کے قریب چھت پر کس طرح جا سکتا ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پوچھا "آفتاب عالم' کیا تم اس عدالت کو بتاؤ گے کہ تمہاری بیوی اس سے پہلے بھی کبوتروں کے لئے خورونوش کا سامان رکھنے چھت پر جاتی رہی ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا "حادثے سے پہلے وہ کئی روز سے یہ کام کر رہی تھی۔"

"ہر روز علی الصبح۔"

"جی ہاں۔"

میں نے پوچھا "اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"اسے کسی "بابا" نے بتایا تھا کہ اگر وہ چالیس روز تک بلاناغہ طلوع آفتاب سے پہلے پرندوں کے کھانے پینے کا انتظام کرے گی تو اس کی گود ہری ہو جائے گی۔"

"آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

وہ تذبذب کا شکار نظر آیا' میں نے وضاحت کی "میرا مطلب رضوانہ سے شادی سے ہے۔"

اس نے جواب دیا "کم و بیش دو سال۔"

"آپ کی کتنی اولادیں ہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

میں نے پوچھا "رضوانہ سے شادی کرنے کی کوئی خاص وجہ؟"

وکیل صفائی اپنا حق استعمال کرتے ہوئے بولا "آبجیکشن یور آنر۔ وکیل استغاثہ غیر متعلق گفتگو کر کے میرے موکل کو الجھانا چاہتے ہیں۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے جناب عالی۔" میں نے جج کو دیکھتے ہوئے کہا "اس کیس میں اگر ملزم آفتاب عالم اور اس کی بیوی مرحومہ رضوانہ کا ذکر غیر متعلقات میں شمار ہوتا ہے تو پھر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھے کیا کہنا چاہئے۔"

جج نے وکیل صفائی کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کی تاکید کی۔ میں نے آفتاب عالم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

وہ منمنایا "آپ اپنا سوال دہرائیں۔"

"رضوانہ سے شادی کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

اس نے الٹا سوال کر دیا "کیا شادی کرنے کے لئے کسی وجہ کا ہونا ضروری ہے؟"

میں نے کہا "شاید آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔" ایک لمحے کی تاخیر سے میں نے اضافہ کیا "چلیں میں وضاحت کیے دیتا ہوں...... آفتاب عالم! آپ ماشاء اللہ سے خاصے وجیہہ و شکیل ہیں۔ آپ کو ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور امیرو کبیر لڑکی مل سکتی تھی' پھر آپ نے ایک واجبی سی شکل کی معمولی لڑکی کا انتخاب کیوں کیا؟"

اس نے جواب میں ایک چھوٹی سی جذباتی تقریر کر ڈالی جس کا لب لباب یہ تھا کہ دل کے معاملات میں شکل و صورت اور مال و دولت نہیں دیکھی جاتی۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جب والیان سلطنت نے معمولی لڑکیوں کی خاطر تاج و تخت

کو ٹھکرا دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو اپنی سیکرٹری سے سچا عشق ہو گیا تھا؟"

"اور مجھے اس بات پر فخر ہے۔"

میں نے کہا "آفتاب عالم' کیا آپ کو یاد ہے کہ تین چار سال قبل آپ فیروزہ بیگم پر بھی مرمٹے تھے۔ بڑا طوفانی عشق ہو گیا تھا آپ کو ان سے۔ پہلے آپ فیروزہ بیگم کی کمپنی میں ایک معمولی ٹائپسٹ تھے' پھر اکاؤنٹینٹ بنے۔ اکاؤنٹینٹ سے مینجر اور بالآخر اپنی باس فیروزہ بیگم کے شوہر بن گئے۔ فیروزہ بیگم کی حادثاتی موت کے بعد آپ بلا شرکت غیرے ان کے گھر اور کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ کمپنی کے مالک ہو گئے۔"

وہ عجیب سے لہجے میں بولا "آپ کو اعتراض کس بات پر ہے وکیل صاحب؟"

"مجھے کسی بات پر اعتراض نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تو بس معزز عدالت کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے افلاطونی عشق سے مجبور ہو کر پہلے اپنے باس اور عمر میں دو چار سال بڑی فیروزہ بیگم سے شادی رچائی۔ اس کی عبرتناک موت کے بعد آپ کو خاصا مالی استحکام حاصل ہوا۔ اس کے بعد آپ نے اپنی سیکرٹری سے دوسری شادی کی اور اس کی حادثاتی موت بھی آپ کے لئے خاصی سود مند ثابت ہو رہی ہے۔ کیا اس کو محض ایک اتفاق سمجھا جائے؟"

"اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔" اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیئے۔

میں نے اچانک سوال کیا "آفتاب عالم! کیا یہ سچ ہے کہ آپ عنقریب ایک اور شادی کرنے والے ہیں...... تیسری شادی!"

وہ چونک گیا "آپ سے کس نے کہہ دی یہ بات؟"

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ آپ کی ہونے والی تیسری بیوی کا آپ کے گھر آنا جانا ہے؟"

"پتہ نہیں' آپ کون سی کہانی سنا رہے ہیں۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا "ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

میں نے کہا "آفتاب عالم' اس لڑکی کا نام انیلا واسطی ہے اور وہ انشورنس کمپنی

کے کلیم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہے۔ آپ دونوں کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ جیسے ہی آپ کو کلیم کی رقم ملے گی' آپ دونوں شادی کر لیں گے لیکن اس مقدمے کی وجہ سے کلیم کی رقم کھٹائی میں پڑ گئی۔ انیلا واسطی کا دعویٰ ہے کہ آپ اس سے بھی بڑا سچا عشق کرتے ہیں جیسا کہ فیروزہ بیگم اور رضوانہ سے کرتے رہے ہیں؟"

"تو آپ دن رات میری جاسوسی میں لگے رہتے ہیں؟" اس نے غصیلی نظروں سے مجھے گھورا۔

میں نے کہا "آپ اسے جاسوسی کے بجائے میری باخبری کہیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ ایک کامیاب وکیل کو یہ سب کرنا پڑتا ہے۔"

وکیل صفائی نے کہا "اگر میرا موکل عشق پیشہ ہے تو وکیل استغاثہ کو کیا تکلیف ہے؟"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے میرے عزیز دوست۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا "میں معزز عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ ملزم آفتاب عالم کو یہ عشق بہت راس آتے ہیں اور ہر شادی اس کے مال و جائیداد میں اضافہ کرتی ہے۔ مرحومہ رضوانہ کی موت سے ملزم کو تقریباً گیارہ لاکھ روپے کا فائدہ پہنچنے والا تھا۔ تین لاکھ وہ وصول کر چکا ہے' مزید آٹھ لاکھ حاصل کرنے کے لئے اس نے ایک طرف تو پولیس کو پچاس ہزار روپے کی رشوت پیش کرکے رضوانہ کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور دوسری جانب کلیم ڈیپارٹمنٹ کی ملازمہ انیلا واسطی کو محبت کا سبز باغ دکھا کر اس کا بھرپور تعاون حاصل کر لیا لیکن....."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ جج جو گہری دلچسپی سے میرا موقف سن رہا تھا' فوراً بول اٹھا "لیکن کیا؟"

"لیکن یہ جناب عالی کہ انیلا واسطی ملزم کی اصلیت سے آگاہ ہو چکی ہے' اس لئے اس نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق جب سے یہ کیس عدالت میں لگا ہے' انیلا نے پلٹ کر بھی ملزم کی خبر نہیں لی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں آفتاب عالم؟"

آفتاب عالم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خجالت آمیز نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے

لگا- میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اور جج کی بھرپور توجہ حاصل کرنے کے بعد کیس پر میری گرفت خاصی مضبوط ہو چکی تھی- اب میں نے براہ راست آفتاب عالم پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی-

میں نے پوچھا "آفتاب عالم! مرحومہ رضوانہ سے شادی کے ایک سال بعد آپ نے ایک خاصی بھاری بیمہ پالیسی خریدی تھی- اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

"بیمہ پالیسی خریدنا قانوناً کوئی جرم نہیں ہے-" اس نے جواب دیا "اور آپ جس پالیسی کا تذکرہ کر رہے ہیں' وہ ہم میاں بیوی کی مشترکہ پالیسی تھی- کاروباری لوگ انکم ٹیکس بچانے کے لئے عام طور پر بیمہ پالیسی خریدتے ہی ہیں- اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

میں نے اگلا سوال کیا "آفتاب عالم' وقوعہ کی رات آپ کتنے بجے گھر آئے تھے؟"

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا "جتنے بجے روز آتا تھا-"

"اور روز کتنے بجے آتے تھے؟"

اس نے بتایا "دس گیارہ بجے-"

"آفتاب عالم!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "آپ کے پڑوسی اشفاق حسین نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ تقریباً دو بجے واپس لوٹے تھے؟"

"وہ سراسر جھوٹ بولتا ہے-"

"کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ آپ نے اس روز گھر آتے ہی اپنی بیوی سے جھگڑا شروع کر دیا تھا؟"

"ہاں' یہ بھی جھوٹ ہے-" وہ بھنا کر بولا "اور یہ بات بھی آپ کو اشفاق حسین ہی نے بتائی ہے-"

میں نے پوچھا "آپ اس بات سے تو انکار نہیں کریں گے کہ رضوانہ سے اکثر آپ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور کئی دفعہ نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی تھی؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "وہ کون سا گھر ہے جہاں میاں بیوی میں نوک جھونک نہیں ہوتی-"

"میں معمولی نوک جھونک نہیں' مار پیٹ کی بات کر رہا ہوں-" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا-

"آپ کا جو دل چاہے' سمجھتے رہیں-" وہ بے پروائی سے بولا-

"آفتاب عالم!" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "کیا یہ سچ ہے انیلا واسطی کچھ عرصہ پہلے تک آپ کے گھر آتی جاتی تھی؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا' میں نے پوچھا "آپ کو یہ بات تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار نہیں ہوگی کہ ایک دو مرتبہ انیلا واسطی' رضوانہ کی موجودگی میں بھی آپ کے گھر میں آئی تھی؟"

"شاید ایک آدھ بار ایسا ہوا تھا-" اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا-

میں نے تیز آواز سے استفسار کیا "اور یہ بات رضوانہ کو سخت ناگوار گزری تھی- اور میں اس نے آپ سے جھگڑا بھی کیا تھا- وہ کسی طرح آپ کے اور انیلا واسطی کے راسم سے آگاہ ہو گئی تھی اور اس بات پر خاصی برہم تھی؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی-" وہ ڈھٹائی سے مکر گیا-

میں نے پوچھا "وقوعہ والی رات آپ دونوں میں کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟"

"رضوانہ میرے دیر سے آنے پر خفا تھی-"

"آپ کتنی دیر سے آئے تھے؟"

"میں رات گئے واپس لوٹا تھا اور......" وہ چونک اٹھا- اچانک اسے احساس ہو گیا کہ اس کے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی تھی- وہ مدد طلب نظروں سے اپنے وکیل کو دیکھنے لگا-

میں نے وکیل صفائی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا "آپ رات گئے گھر لوٹے تھے اور رضوانہ نے اس پر واویلا مچایا تھا- اس کا خیال تھا کہ آپ انیلا واسطی کے ساتھ تھے......"

میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا- اس کے چہرے پر کئی ایک رنگ آ کر گزر گئے- اس نازک موقع پر وکیل صفائی نے اپنی فیس حلال کرنے کی کوشش کی-

"آبجیکشن یور آنر!" اس نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کہا "وکیل استغاثہ ٹریک سے

ہٹ رہے ہیں۔ انیلا واسطی کا موجودہ کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے فا
دوست انیلا واسطی اور میرے موکل کے تعلقات سے کیا ثابت کرنے کی کوشش
رہے ہیں؟"

جج نے استفساریہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا "جناب عالی! ملزم میر
سوال کے جواب میں کچھ دیر پہلے بتا چکا ہے کہ وہ حسب معمول وقوعہ والی رات
گیارہ بجے تک گھر پہنچ گیا تھا۔ اب اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ رات گئے گھر آیا تھا۔
کے بیان میں واضح تضاد موجود ہے۔ مَیں انیلا واسطی کے ذکر سے یہ ثابت کرنے
کوشش کر رہا ہوں کہ ملزم اول نمبر کا جھوٹا ہے۔ اس نے کئی بار بیان بدلنے
کوشش کی ہے۔"

جج نے نفرت آمیز نظروں سے آفتاب عالم کو گھورا' پھر پوچھا "تمہارے کون
جواب کو درست سمجھا جائے؟"

"جو آپ بہتر سمجھیں جناب۔"

اس جواب نے جج کو غصے میں مبتلا کر دیا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا "یہ عدالت کا
ہے' میرے سوال کا درست اور واضح جواب دو ورنہ میں توہین عدالت میں تمہیں
بھیج دوں گا۔"

آفتاب عالم نے تھوک نگل کر حلق تر کیا' پھر بولا "جناب عالی! وقوعہ کی رات
واقعی خاصی دیر سے گھر پہنچا تھا' تقریباً دو بجے کے بعد۔"

جج نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا' پھر مجھے جرح جاری ر
کا اشارہ کیا۔ میں پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ میں نے کٹہرے میں موجود آفتاب عالم
پوچھا۔

"تمہارے فلیٹ کے عین نیچے فرسٹ فلور پر کون رہتا ہے؟"

اس نے برا سا منہ بنایا اور جواب دیا "منشیات فروش سعید بخاری۔"

"اپنے جواب کو وکیل صاحب کے سوال تک محدود رکھو۔" جج نے ایک مرتبہ
اسے جھاڑ پلائی۔ وہ سہم کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا "آفتاب عالم' سعید بخاری کے بقول وقوعہ کے روز فجر سے پہلے

ں کے دروازے کے سامنے سے گزر کر نیچے گئے تھے اور تمہارے کندھے پر بھی کچھ
دا ہوا تھا......"

میرا سوال پورا ہونے سے پیشتر ہی وہ بول اٹھا "میرے کندھے پر تو کچھ بھی نہیں
ا۔" اس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

میں نے کہا "چلو مان لیتے ہیں کہ تمہارے کندھے پر کچھ بھی نہیں لدا ہوا تھا۔
ب اتنا تو بتا دو کہ تم رات کے آخری پہر اپنے فلیٹ سے کیوں نکلے تھے؟"

"میرا جی گھبرا رہا تھا۔" وہ لرزاں لہجے میں گویا ہوا "میں نے سوچا' ذرا تازہ ہوا
ں دو چار لمبی لمبی سانسیں لوں۔"

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا "لیکن سعید بخاری کا تو کہنا ہے کہ تم ایک
ٹ سے بھی پہلے واپس اوپر چلے گئے تھے؟"

اب آفتاب عالم کے چہرے پر زردی کھنڈ چکی تھی۔ اس کی آواز سے بھی نقاہت
اہر ہو رہی تھی۔ اس نے بتایا "وہ بات یہ ہے کہ باہر اس وقت اچھی خاصی سردی ہو
ہی تھی' اس لئے میں جلد ہی واپس چلا گیا تھا۔"

میں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا "آفتاب عالم' تم کچھ
ر پہلے مجھے بتا چکے ہو کہ وقوعہ کی رات پچھلے پہر تم گہری نیند سو رہے تھے اور اس
ران میں جو واقعات پیش آئے' تم ان سے قطعی بے خبر تھے بلکہ بعد میں تمہاری
لہ نے تمہیں اس بارے میں بتایا تھا۔ اب تمہارا بیان ہے کہ تم تازہ ہوا میں گہری
انسیں لینے کے لئے فلیٹ سے نیچے اترے تھے۔ تمہارے کون سے بیان کو درست
لیم کیا جائے؟"

اس کی ہمت جواب دے گئی اور ۔ کٹہرے کی دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔
انے تابڑ توڑ سوالات شروع کر دیئے۔

"آفتاب عالم! کیا تم اس عدالت کو بتاؤ گے کہ علی الصبح تمہاری بیوی چھت پر
نے سے پہلے جوتا پہننا کیوں بھول گئی؟"

اس نے رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھا لیکن میں اس موقع پر کسی رو رعایت کا
اوار نہیں تھا' میں نے پوچھا "اور سردی کے اس موسم میں وہ سویٹر تو کیا' سر پر

دوپٹہ اوڑھنا بھی بھول گئی۔ تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟"

وہ نحیف سی آواز میں منمنایا "میں اب آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

میں نے اپنا روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا "یور آنر! ساری صورتحال روز روشن کے مانند معزز عدالت کے سامنے عیاں ہو چکی ہے۔ اب اس کیس کا کوئی پہلو ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ ملزم آفتاب عالم اپنی بیوی کا قاتل ہے۔ اس نے معزز عدالت کے سامنے متعدد جھوٹ بولے ہیں اور بار بار اپنا بیان بدلا ہے جو اس کے مجرم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔"

میں نے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا "جناب عالی! ملزم لالچی فطرت کا مالک ایک زرپرست انسان ہے۔ اس نے سیونگ سرٹیفکیٹ اور بیمہ پالیسی کی بھاری رقم حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر اس کی موت کو حادثاتی رنگ دینے کے لئے اسے گلی میں پھینک دیا۔ علاوہ ازیں اس نے پولیس کی مٹھی گرم کرکے انہیں سرسری تفتیش کے بعد فائل کو داخل دفتر کرنے پر آمادہ کر لیا اور کام ہو جانے کے بعد بیوی کی حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیا۔"

ملزم بخوبی اس بات سے آگاہ تھا کہ یہاں مرحومہ کا کوئی عزیز رشتے دار موجود نہیں تھا۔ اس کی چھوٹی بہن اور بہنوئی بھی ملک سے باہر تھے' اس لئے اسے اپنے کام میں آسانیاں ہی آسانیاں نظر آئیں۔ وہ بڑی حد تک اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہو چکا تھا۔ عنقریب اسے انشورنس کی رقم ملنے ہی والی تھی کہ اس کی سالی فوزیہ اور ہم زلف خلیق الزماں نے یہاں آکر اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اس طرح ملزم کا منصوبہ فلاپ ہو گیا۔"

میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد جج سے درخواست کی "جناب عالی! میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ ملزم آفتاب عالم کو پولیس کسٹڈی میں دے کر از سر نو اس کیس کی تفتیش کروائی جائے۔ علاوہ ازیں پولیس کو ہدایت کی جائے کہ وہ جلد از جلد اپنی تفتیش مکمل کرکے چالان عدالت میں پیش کر دے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔

"یور آنر! اب تک کی عدالتی کارروائی نے صورت حالات کی وضاحت کر دی ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ ملزم نے جس طرح میری جرح کے جواب میں بارہا دروغ گوئی سے کام لیا ہے' وہ عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ ہو چکا ہے۔ اس کے مجرم ہونے میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں معزز عدالت سے میں درخواست کروں گا کہ اس مقدمے کا جلد از جلد فیصلہ سنایا جائے۔"

پھر میں نے اس درخواست کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا "جناب عالی! مدعیہ فوزیہ اور ان کے شوہر خلیق الزماں کافی عرصے سے یہاں ہیں۔ خلیق الزماں کئی مرتبہ اپنی چھٹی بڑھوا چکے ہیں۔ اس مقدمے میں تاخیر ان کی ملازمت پر اثرانداز ہو سکتی ہے۔ دیٹس آل یور آنر۔"

پھر میں اپنی مخصوص سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا۔ میں مطمئن تھا کہ اپنے حصے کا کام میں نے بحسن و خوبی نمٹا دیا تھا۔ ملزم آفتاب عالم نے جس طرح بار بار پینترا بدلا تھا اور میرے سوالات کے غیر اطمینان بخش جواب دیئے تھے' ان سے وہ جج کی نظروں میں مشکوک ٹھہر چکا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جج اٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ نمودار ہوا اور آکر اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ پھر اس نے ملزم آفتاب عالم کو حوالہ پولیس کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ اس نے خاص طور پر پولیس کو ہدایت کی تھی کہ عرصہ سات یوم کے اندر اندر چالان عدالت میں پیش کر دیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر نکلے تو فوزیہ نے پوچھا "بیگ صاحب! آپ کا کیا خیال ہے۔ وہ مردود آپ اپنے جرم کا اقرار کر لے گا؟"

میں نے کہا "پولیس والے یہ کام کروانا بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"اس نے تو پہلے بھی پولیس کو بھاری رشوت دے کر خرید لیا تھا۔" فوزیہ نے اپنے دلی خدشات کا اظہار کیا "کیا وہ اب ایسا نہیں کر سکتا؟"

"اب یہ ممکن نہیں رہا۔" میرے بجائے خلیق الزماں نے کہا "بیگ صاحب نے بھری عدالت میں جس طرح سابق تفتیشی افسر سرفراز شاہ کو رگیدا ہے اور بعدازاں ملزم کے کرتوتوں کی نقاب کشائی کی ہے' اس کے پیش نظر پولیس اب کوئی کچا ہاتھ نہیں ڈالے گی۔"

میں نے کہا "موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اب پولیس پوری کوشش کرے گی کہ وہ ملزم سے اقبال جرم کروا لے ورنہ خود ان کے پھنسنے کے امکانات روشن ہیں۔"

اس کے بعد وہ دونوں میاں بیوی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ میں ایک دوسری عدالت کی طرف جانے لگا تو برآمدے کے ایک سرے پر مجھے ملزم کے ضعیف والدین کھڑے نظر آگئے۔ میں غیر ارادی طور پر ان کے قریب چلا گیا۔

مجھے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ خوفزدہ نظر آنے لگے۔ میں نے بوڑھے مشرف حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بزرگوار' میرے محتاط اندازے کے مطابق آپ کی عمر ستر کا ہندسہ عبور کر چکی ہے۔" پھر میں نے حسینہ بیگم کی طرف دیکھا "اور خاتون' آپ بھی کسی طور ساٹھ سے کم کی نہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ دونوں نے حج بھی کر رکھا ہے اور خاصے دیندار ہیں۔"

وہ دونوں سراسیمہ نظروں سے مجھے تکنے لگے' میں نے کہا "اس عمر میں آپ کو اس جہان کے بجائے اس جہان کی فکر کرنا چاہئے۔ یہاں کی بہ نسبت وہاں کا فائدہ آپ کے لئے زیادہ اہم ہے۔ اپنے مجرم بیٹے کو بچانے کے لئے آپ کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ اس کی حمایت میں جھوٹ بول کر آپ کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس کا سزا سے بچنا اب ممکن نہیں رہا۔"

ان کے چہروں پر ندامت کے آثار ابھر آئے۔ میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ اس ندامت میں ایک بے زبان سا کرب بھی شامل تھا جو ظاہر ہے' ان کے بیٹے کے انجام سے متعلق تھا۔ وہ بیٹا جس کی زندگی کے دن گنے جا چکے تھے۔

میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان پیش کر دیا۔

ملزم آفتاب عالم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔ اس نے پہلے پولیس کو اور پھر عدالت میں جو اقبالی بیان دیا' اس کا خلاصہ یہ تھا۔

انشورنس کمپنی کی ملازمہ انیلا واسطی کو اس نے پوری طرح اپنے چنگل میں پھانس رکھا تھا اور عنقریب وہ شادی کرنے والے تھے' تاہم مرحومہ رضوانہ کو ان کے عزائم کی خبر مل گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ رضوانہ اس کے لئے کسی قسم کی مشکلات پیدا کرتی' آفتاب عالم نے اسے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح وہ دہرا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ایک طرف سے اسے رضوانہ سے نجات مل جاتی اور دوسری جانب وہ پالیسی کی رقم حاصل کر لیتا۔

آفتاب عالم نے رضوانہ کو ٹھکانے لگانے کے کئی منصوبے بنائے اور بگاڑے حتیٰ کہ اس وقت اس کی مشکل آسان ہو گئی جب رضوانہ نے باقاعدگی سے چھت پر جا کر کبوتروں کے لئے دانے پانی کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ چپکے سے دھکا دے کر رضوانہ کو چھت سے نیچے گرا دے گا۔ وہ بھی اس طرح کہ رضوانہ کو بھی اس سازش کا احساس نہیں ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ اچانک پاؤں پھسل جانے سے وہ گر گئی تھی۔

آفتاب عالم نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے پچیس دسمبر کا دن منتخب کیا تھا لیکن وقوعہ کے روز جب وہ گھر آیا تو رضوانہ نے حسب معمول اس سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا۔ پھر بات اتنی بڑھ گئی کہ نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی' اسی دوران میں آفتاب عالم نے فیصلہ کیا کہ یہ اچھا موقع ہے' اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ چنانچہ اسی ہاتھ پائی کے دوران میں اس نے رضوانہ کا سر اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لیا' پھر زوردار انداز میں بیڈ کے کنارے سے اس کے سر کو ٹکرا دیا۔

بیڈ کے کنارے اور رضوانہ کے سر کے درمیان تصادم خاصا شدید ثابت ہوا' رضوانہ کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

شور کی آواز سن کر آفتاب کے والدین بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ ملازمہ شہناز ان

دنوں اندرون سندھ اپنے گھر والوں سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ گھر میں صرف گھر کے افراد ہی تھے۔ عمر رسیدہ اور جہاندیدہ حاجی مشرف حسین نے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ رضوانہ کے وجود میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ سب سر جوڑ کر اس مسئلے کا حل سوچنے لگا۔ آفتاب کے مکارانہ ذہن نے چھت سے گرنے والا آئیڈیا پیش کیا جس پر سب نے اتفاق کیا۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا' اس کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

بوڑھے مشرف حسین نے اس معاملے کو راز رکھنے اور بیٹے کی حمایت کے سلسلے میں اپنی بیوی حسینہ بیگم کو بھی ایک مخصوص بیان رٹوا دیا تھا جو سراسر آفتاب عالم کے حق میں جاتا تھا۔

ممکن تھا کہ یہ معاملہ دب دبا ہی جاتا' اگر خلیق الزماں اور فوزیہ اس سلسلے میں خصوصی دلچسپی کا اظہار نہ کرتے اور مظلومہ و مرحومہ رضوانہ کے قاتل شوہر کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے پاکستان نہ آتے۔

ملزم کے اقبال جرم کے بعد سارا کیس حل ہو گیا تھا۔ آئندہ دو تین پیشیوں میں بس رسمی سی عدالتی کارروائی ہوئی اور عدالت نے آفتاب عالم کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 302 کے تحت سزائے موت سنا دی۔

فیروزہ بیگم ایک بیوہ اور تن تنہا عورت تھی اور شوہر کی وفات کے بعد تو وہ بالکل ہی اکیلی رہ گئی تھی۔ چنانچہ چرب زبان آفتاب عالم نے بہ آسانی اسے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا۔ اگر فیروزہ کا کوئی والی وارث موجود ہوتا تو ممکن تھا' اس کے جل مرنے کے بعد کوئی عدالتی کارروائی کی جاتی۔

آفتاب عالم نے بڑی خوبصورتی سے اپنی دوسری بیوی رضوانہ کو بھی ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن اس کی قسمت بری کہ عین وقت پر وہ پھنس گیا۔ یہ بات وثوق سے تو نہیں کہی جا سکتی تھی کہ فیروزہ کے جل کر جاں بحق ہونے میں بھی آفتاب عالم کا ہی ہاتھ تھا لیکن اس کی لالچی اور حریص فطرت کے پیش نظر یہ بات بعید از امکان بھی نہیں تھی۔

بہرحال وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ جس دولت کی خاطر اس نے اپنی معصوم

بیوی کے خون میں ہاتھ رنگ لئے تھے' وہ اس کے کسی کام نہ آسکی اور نہ ہی اس عورت (انیلا واسطی) نے پلٹ کر اس کی خبر لی جس سے شادی رچانے کے لئے وہ رضوانہ کو اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔

دولت کے حصول کے لئے اندھا دھند بھاگنے اور اس دوڑ میں برے بھلے کی تمیز کھو دینے والوں کا بالآخر یہی انجام ہوتا ہے۔

○

گرفتار اجل

اس کائنات میں عدل و انصاف کے تین نظام مصروف عمل ہیں۔

اول ضمیر انسانی۔ جب کسی شخص سے کوئی غیر اخلاقی یا غیر انسانی یا غیر فطری فعل بہ الفاظ دیگر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے' چاہے وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ مذکورہ شخص کے خیالات' جذبات اور احساسات پر ایک نامعلوم سا بوجھ بہرحال ضرور موجود رہتا ہے۔ اسے ایک طرح کا پچھتاوا اور ندامت سی محسوس ہوتی ہے۔ ضمیر کی آواز پر کان دھرنے والوں کی تعداد فی زمانہ ہر گزرتے دن کے ساتھ کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ دوسرے نمبر پر اس دنیا کا عدالتی نظام ہے۔ یہ نظام اس قدر پیچیدہ ہے کہ اس کی نیرنگیوں اور داؤ پیچ کو سمجھنا ایک عام انسان' خصوصاً غریب آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ عدالت ہر بات کا ثبوت مانگتی ہے اور جج' وکیلوں کی جرح اور دلائل کی روشنی میں فیصلے صادر کرتا ہے جبکہ ایک ہوشیار' چرب زبان اور قانون شناس وکیل سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک عام آدمی کو انصاف کے حصول کیلئے دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔ اسی فیصد افراد وکیل کی فیس' کورٹ فیس اور دیگر اخراجات و وقت کے زیاں کی تاب نہ لاتے ہوئے مقدمے بازی ہی سے تائب ہو جاتے ہیں۔ وہ صبر کی چادر تان کر سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ تیسرا نظام عدل مکافات عمل ہے یعنی نظام قدرت یا لا آف نیچر-- جہاں کسی ثبوت' گواہ' وکیل' دلائل اور جرح کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک چیونٹی کے مسلے جانے سے لے کر اقوام کے تہ تیغ ہو جانے تک کے تمام فیصلے نیت کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ وہاں دنیاوی عدالت کی کامیابی و

ناکامی-- بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس عدالت کا منصف اعلیٰ صرف اللہ کی ذات ہے۔ انسان کو ہر وقت اس قاضی القضاۃ سے ڈرتے رہنا چاہئے کیونکہ اس کے فیصلوں کے خلاف کہیں اپیل نہیں کی جا سکتی۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ہفتے کے روز دو افراد میرے دفتر میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے حلئے سے خالص پٹھان نظر آتے تھے مگر ان کے معاشرتی مقام میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک خاصا آسودہ حال دکھائی دیتا تھا جبکہ دوسرا اپنی وضع قطع اور لباس سے غریب صورت اور بے چارہ سا لگتا تھا۔ "ٹھیک ٹھاک" خان صاحب کو دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا مگر فوری طور پر مجھے اندازہ نہ ہوا کہ ایسی کون سی عجیب بات اس میں تھی جس نے مجھے چونکا دیا تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور انہیں بیٹھنے کیلئے کہا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ان کی آمد کا مقصد دریافت کیا۔ "جی فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

اپنے پہناوے سے متمول نظر آنے والے خان صاحب نے کہا۔ "آپ نے مجھے پہچانا نہیں وکیل صیب؟"

میں نے اس بار ذرا غور سے اس کا جائزہ لیا مگر کوشش کے باوجود بھی یاد نہ آ سکا کہ میں پہلے بھی کبھی اس سے مل چکا ہوں۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "سوری' میں واقعی آپ کو پہچان نہیں سکا۔ اگر زحمت نہ ہو تو خود ہی تعارف کروا دیں۔"

"چہ' آپ کیسے وکیل صیب ہو؟ ابھی ایک سال پہلے امارا ملاقات ہوا اور آپ بھول بھی گیا۔ اسی دپتر میں ام آیا تھا۔ اور ایک جوڑے والا بیگم صیب بھی بیٹھا تھا۔ وہی جس نے ساڑی ماڑی بھی باندھ رکھا تھا اور اس کی انگلیوں میں بوت سارا ہیرے کا انگوٹھی بھی تھا۔ جگ مگ کرتا ہوا۔ کچھ یاد آیا وکیل صیب؟"

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ آنکھیں سکیڑ کر مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی طولانی تعارفی کوشش کو نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ "آپ کا نام کیا ہے اور آپ ایک

سال قبل کس سلسلے میں مجھ سے ملنے آئے تھے؟"

"بوت اپسوس کا بات ہے وکیل صیب!" وہ اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے گردن کو دائیں بائیں حرکت دے کر بولا۔ "آپ کو امارا نام بھی یاد نہیں رہا۔ ام ادھر آپ کے پاس اپنے جگری یار حیدر علی کا کیس لے کر آیا تھا۔"

"کیس کیا تھا؟" میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ اس دوران میں مسکین صورت خان صاحب نے ایک لفظ بھی بول کر نہیں دیا تھا۔

"پہلے ام آپ کو اپنا نام بتائے گا۔" وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ "امارا نام سن کر سارا مالمہ آپ کی سمجھ شریف میں آ جائے گا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بتایا۔ "امارا نام اول خان ہے۔" پھر وہ ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے میں ابھی اٹھ کر اس سے بغل گیر ہو جاؤں گا۔

اول خان کا نام سن کر مجھے یہ تو محسوس ہوا کہ میں پہلے بھی اس نام کے شخص سے مل چکا ہوں شاید اسی لئے اس کے دفتر میں داخل ہوتے ہی مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا لیکن کوشش کے باوجود بھی مجھے یاد نہ آ سکا کہ وہ کیوں میرے پاس آیا تھا۔ اس لئے میں نے ایک مرتبہ پھر اس سے یہ سوال کیا۔

وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "خو وکیل صیب' آپ ام سے مذاق فرماتا ہے۔ وہ حیدر علی امارا جگری یار تھا نا' اس نے بوت مامولی سا واردات کر دیا تھا۔ بس دو بندوں کو قتل مٹل کر دیا تھا اور پولیس نے اسے پکڑ کر گلشن تھانے میں بند کر دیا تھا۔ ام نے پولیس والوں سے تو معاملہ پٹ کر لیا تھا مگر آپ نے ایں بوت مایوس کیا تھا۔ ام نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ پیس میس کا پکر مت کرو۔ امارے پاس بہت پیسہ ہے لیکن آپ نے ام کو صاف ٹرخا دیا۔ آپ بولا' اول خان' ام تمہارے یار کو رہا نہیں کروا سکتا' تم کوئی دوسرا وکیل ڈھونڈ لو۔"

مجھے اب بھی کچھ یاد نہیں آیا تھا لیکن اگر میں اپنے ان خیالات کا اظہار اول خان کے سامنے کر دیتا تو وہ مجھے یاد دلانے کیلئے واقعات کا پنڈورا باکس کھول کر بیٹھ جاتا اس لیے میں نے عافیت اسی میں جانی کہ اسے پہچاننے کا اقرار کر لوں۔ میرے اقرار پر خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ذرا نارمل ہوا تو میں نے اس کی آمد کی غرض

و غایت دریافت کی۔

"وکیل صیب! اس بار بالکل جائز کیس ام آپ کے پاس لے کر آیا ہے۔" اول خان نے کہا پھر اپنے ساتھی مسکین صورت شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ امارا بھائی بندوق خان ہے۔ اس کے بچہ لوگ کو پولیس نے تھانے میں بند کر دیا ہے۔"

وہ اپنے خستہ حال ساتھی کو اپنا بھائی بتا رہا تھا۔ مجھے یہ بات ہضم نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھا۔ "اول خان! کیا بندوق خان تمہارا سگا بھائی ہے؟"

وہ میرے سوال کی تہ میں پوشیدہ مطلب سے آگاہ ہو گیا' فوری جواب دیا۔ "نئیں وکیل صیب! یہ امارا سگا بھائی نئیں اے۔ یہ امارا پٹھان بھائی ہے۔ وہ آپ نے سنا نئیں' سب پٹھان آپس میں بھائی بھائی ہے۔"

مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ "خان صاحب! میں نے تو یوں سن رکھا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

"خو وکیل صیب' آپ بھی کھال کا بال نکالتا ہے' امارا مطلب وہی تھا۔"

محاورے کے استعمال نے مجھے ایک مرتبہ پھر ہنسنے پر مجبور کر دیا' تاہم میں نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور براہ راست متعلقہ سوال کیا۔ میں نے اس مرتبہ بندوق خان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "بندوق خان' پولیس نے تمہارے بچے کو کیوں پکڑ رکھا ہے؟"

بندوق خان نے جواب دینے سے پہلے اول خان کی طرف دیکھا جیسے اس سے پوچھ رہا ہو کہ وہ کیا جواب دے۔ اول خان نے اس کی مشکل کو سمجھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "آپ ام سے پوچھیں وکیل صیب' بندوق خان بوت پریشان ہے۔ یہ ٹھیک طرح بات نئیں کر سکے گا۔"

میں نے وہی سوال اول خان سے پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ "بندوق خان کے بچہ لوگ کو پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔"

میں اپنی کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "اول خان' تم نے تو کہا تھا کہ اس بار بالکل جائز کیس لے کر آئے ہو؟"

"خدا پاک کا قسم ام نے سولہ آنہ ٹھیک کہا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "تو تمہارا خیال ہے، قتل بندوق خان کے لڑکے نے نہیں کیا؟؟"

"امارا پکا یقین اے وکیل صیب! قتل کسی اور نے کیا ہے۔ بارود خان کو خوامخواہ اس میں ملوث کیا گیا اے۔"

"یہ بارود خان کون ہے؟؟"

"بندوق خان کا بچہ لوگ، جو تھانے میں بند ہے۔" اول خان نے وضاحت کی۔

"وکیل صیب! ام ایک سال پہلے جب آپ کے پاس آیا تو سو پی سد سچ بولا۔ امارے یار حیدر علی نے دو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔ ام نے آپ کو صاف صاف بتا دیا تھا۔ اب بھی ام صاف بات کرتا ہے۔ بارود خان نے قتل نئیں کیا، بچہ لوگ بالکل بے گناہ ہے وکیل صیب!"

وہ بار بار بارود خان کو بچہ لوگ کہہ کر بات کر رہا تھا۔ مجھے ملزم کے نام اور طرز تخاطب میں عجیب سا تضاد محسوس ہوا۔ میں نے اپنی الجھن کو دور کرنے کی خاطر پوچھا۔ "اول خان! بارود خان کی عمر کتنی ہے؟؟"

"خدا آپ کا بھلا کرے وکیل صیب!" اول خان نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا پھر بندوق خان سے اپنی مادری زبان میں کچھ گفت و شنید کے بعد مجھے بتایا۔ "وکیل صیب، بچہ لوگ بیس سال کا ہے۔"

"بیس سال کا ہے اور --- ابھی تک بچہ لوگ ہے؟؟"

اول خان بڑے بھونڈے انداز میں مسکرایا اور پھر بولا۔ "آپ دیکھے گا تو خود بہ خود سمجھ جائے گا۔ وہ آپ کو بھی بچہ ہی لگے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "قتل کس کا ہوا ہے؟؟"

"ایک بی بی لوگ مارا گیا ہے۔" اس مرتبہ بارود خان کے باپ بندوق خان نے جواب دیا۔

پندرہ بیس منٹ کی مزید دماغ سوزی کے دوران میں اول خان اور بندوق خان نے میرے سوالات کے جواب میں جو واقعات سنائے ان کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

ملزم بارود خان کی عمر لگ بھگ بیس سال تھی مگر دیکھنے میں وہ کسی طور بھی بارہ تیرہ سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ اپنے پستہ قد اور کمزور کاٹھی کی وجہ سے بھی وہ کوئی معصوم بچہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ ان دنوں وہ ایک ایرانی ریسٹورنٹ میں بیرا گیری کر رہا تھا۔ ساتویں جماعت میں سات مرتبہ فیل ہونے کے بعد کوئی دو سال پہلے اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور اس دو سال کے عرصے میں اس نے مختلف نوکریاں کی تھیں۔ گرفتاری سے قبل وہ ایرانی ریسٹورنٹ میں بیرے کے طور پر کام کر رہا تھا۔ یہ ریسٹورنٹ ایم اے جناح، المعروف بہ بندر روڈ پر واقع تھا۔ ایک خاص بات جو میرے علم میں آئی وہ یہ تھی کہ قریب قریب تین ماہ تک بارود خان نے اس دفتر میں بھی ملازمت کی تھی جہاں قتل کی واردات ہوئی تھی۔ وہ ایک شام کے اخبار کا دفتر تھا۔ اخبار غیر معروف تھا مگر بہرحال تواتر سے شائع ہوتا تھا اگرچہ بکتا کم اور دکھتا زیادہ تھا۔ ایسے اخبارات خبروں سے زیادہ اشتہارات اور سیاسی جوڑ توڑ کی بنیاد پر پنپتے تو ہیں مگر پھولتے پھلتے نہیں ہیں۔ اس اخبار کا دفتر بھی بندر روڈ پر ہی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں تھا اور ایرانی ریسٹورنٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اخبار کا دفتر عمارت کے تھرڈ فلور پر تھا۔

مقتولہ ایک عیسائی لڑکی تھی۔ اس کا نام فلوری اور عمر کم و بیش پچیس سال تھی۔ وہ اسی اخبار کے دفتر میں ملازم تھی۔ اخبار کا نام ہم اپنی سہولت کیلئے فائیو اسٹار فرض کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اخبارات کے نام اس نوعیت کے ہوتے نہیں ہیں پھر بھی فرض کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ فلوری کا قتل باس کے کمرے میں ہوا تھا یعنی اخبار کے ایڈیٹر و پبلشر فرید الدین کے کمرے میں۔ فرید الدین لمبے بالوں والا ایک توندیلا شخص تھا۔ اس کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی اور چشمے میں گلاسز کی جگہ عدسوں نے لے لی تھی۔ اسے خوب صورت تو کیا، قبول صورت کہنا بھی زیادتی تھی۔

ان آدھی ادھوری باتوں سے کیس پر مناسب روشنی نہیں پڑتی تھی۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اول خان نے کہا۔ "خو وکیل صیب، آپ خود اور حوالات میں بارود خان سے ملاقات کرو۔ وہ آپ کو پوری کہانی سنائے گا۔"

میں نے بندوق خان سے پوچھا۔ "آپ کے بیٹے نے پولیس کو کیا بیان دیا

ہے؟"

"پولیس نے اسے ادر ہوٹل سے ہی گرفتار کر لیا تھا۔ ام اور امارا بی بی رات کو تھانے گیا مگر پولیس والوں نے ایں اس سے بات بھی نئیں کرنے دیا۔" بندوق خان کی بات ختم ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ "ایں کچھ مالوم نئیں، اس نے پولیس کو کیا بیان دیا؟"

"بارود خان کو کل کس وقت گرفتار کیا گیا تھا؟"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "کل دوپہر میں۔"

"کیا پولیس نے آج صبح بارود خان کو عدالت میں پیش نہیں کیا؟"

بندوق خان روہانسے لہجے میں بولا۔ "ام کو کیا مالوم۔ ام تو رات ایک پل کیلئے بھی نہیں سویا۔ صبح ہوتے ہی ام اول خان کے پاس گیا۔ اچھا ہوا، آج کل امارا دن کا ڈیوٹی نئیں تھا۔ ام اور اول خان کے گھر بیٹھا رہا۔ یہ بہت دیر سے آیا۔ پھر ام سیدھا آپ کے پاس چلا آیا۔ اس کے بعد ادر سے پارغ ہو گا تو رات ڈیوٹی پر جائے گا اور ایک پیکٹری میں ام چوکیدارا کرتا ہے۔"

"اول خان، تم تو خاصے سمجھ دار آدمی ہو۔" میرے جملے پر وہ پھول گیا اور سینہ تان کر مسکراتے ہوئے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "تمہیں یہ بات معلوم ہو گی کہ پولیس کسی ملزم کو ریمانڈ حاصل کئے بغیر ایک رات سے زیادہ حوالات میں نہیں رکھ سکتی۔ اگر وہ ابھی تک حوالات میں ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ آج پولیس نے بارود خان کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہو گا۔"

"ایک دم ٹیک بولا وکیل صیب!" اول خان نے تیز آواز میں کہا۔ "ام اس خانہ خراب کا بچہ پولیس مولیس کا سب کارروائی جانتا ہے۔۔۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو جب تک پولیس اپنی تفتیش مکمل کرنے کے بعد عدالت میں چالان پیش نہیں کر دیتی، اس وقت تک میں کچھ نہیں کر سکتا، ضمانت کی درخواست تو اس کے بعد ہی دائر کی جا سکتی ہے۔"

"ایں سب مالوم ہے وکیل صیب!" اول خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پولیس کو اپنا کام کرنے دیں اور آپ اپنا کام کریں۔"

اس کے بعد اس نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میرے سامنے میز پر ڈال دی۔ وہ سو روپے والے نوٹوں کی گڈی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ "وکیل صیب، یہ ایڈوانس ہے۔ پورا دس ہزار روپیہ۔۔۔ اور اس کا رسید لکھنے کا ضرورت بھی نئیں اے۔ یاد اے، پچھلے سال ام نے حیدر علی کا کیس میں آپ کو پانچ ہزار روپیہ پیشگی دینے کا کوشش کیا تھا اور کاغذ بھی مانگا تھا۔ وکیل صیب، اس وقت تو ام بوت غصے میں تھا اور دل میں آپ کو گالیاں دیتا ہوا واپس چلا گیا تھا مگر خدا گواہ ہے وکیل صیب، آپ کا ایمان داری نے ایں بوت متاثر کیا، اسی واسطے ام دوبارہ آپ کے پاس آیا اے۔ اب جلدی سے بارود خان کا کیس لڑنے کا تیاری میاری کریں۔ اگر پیسہ کم ہو تو ام بعد میں اور بھی دے گا۔"

میں نے کہا۔ "اول خان، اس کیس کی بہت سی باتیں ابھی وضاحت طلب ہیں۔ جب تک میری تسلی نہ ہو جائے، اس وقت تک میں کوئی کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا۔"

"کیسا تسلی وکیل صیب!" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "ام نے بول دیا اے، بعد میں اور پیسہ بھی دے گا۔ پکر کا کوئی بات نئیں اے۔ ام آپ کو خوش کر دے گا۔"

"فیس تو میں آپ سے پوری وصول کروں گا مگر تسلی سے میری مراد کچھ اور تھی۔"

"کیا مراد تھا آپ کا؟"

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے کہ بارود خان بے گناہ ہے، میں کوئی پیش رفت نہیں کروں گا۔"

"او یارا، ایک تو تم بوت مشکل الپاز بولتا اے۔ ادر حوالات میں جا کر اپنا تسلی مسلی کرو نا۔ بچہ لوگ آپکو اپنی بے گناہی کا پوری کہانی سنائے گا۔" اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب ام کو اجازت دو وکیل صیب۔ ام کو بوت ضروری کام

اے۔ اور آتا جاتا رہے گا۔" میرے استفسار پر اس نے مجھے اس تھانے کا نام بتا دیا جہاں بارود خان بند تھا۔

میں نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' میں واپسی پر متعلقہ تھانے سے ہوتا جاؤں گا۔ آپ لوگ کل پھر اسی وقت --- اوہ سوری ---" میں نے ٹیبل کلینڈر پر نگاہ ڈالتے ہوئے معذرت کی۔ "کل تو اتوار ہے' آپ پیر کے روز اسی وقت میرے پاس آجائیں' پھر تفصیلی بات ہو گی۔"

وہ دونوں میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

مذکورہ تھانہ میرے راستے ہی میں پڑتا تھا۔ میں نے اپنی سیکریٹری شیریں کو سعید منزل پر ڈراپ کیا اور گاڑی کا رخ متعلقہ تھانے کی جانب موڑ دیا۔ تھانوں کے انچارج عام طور پر اس وقت تھانے میں کم ہی ملتے ہیں۔ میں نے ایس ایچ او کے کمرے میں جھانک کر دیکھا' حسب توقع اس کی سیٹ خالی تھی۔ ایک دوسرے کمرے میں چند پولیس اہل کار موجود تھے۔ انہی میں ایک ایس آئی (سب انسپکٹر) بھی تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اپنا مدعا بیان کیا۔

"میں حوالاتی بارود خان سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

ایس آئی نے سرتاپا میرا جائزہ لیا پھر سوال کیا۔ "آپ کی تعریف؟"

"میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں ملزم بارود خان کا وکیل ہوں۔"

"اوہ' تو آپ وکیل صاحب ہیں؟" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "آپ کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ ملزم عدالتی ریمانڈ پر ہے۔ آپ سات روز بعد عدالت میں اس سے ملاقات کر سکتے ہیں۔"

میں یہ بات جانتا تھا کہ قتل کا ملزم ریمانڈ پر ہو تو تھانے والے چالان پیش کرنے سے پہلے کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے اور خاص طور پر وکیلوں سے تو وہ بہت بدکتے ہیں۔ اس قسم کی صورتحال میں ہمیں ذرا ہیر پھیر سے کام لینا پڑتا ہے۔ ملزم سے ملاقات کی اجازت نہ دینے کی سب سے بڑی وجہ یہ خدشہ ہوتا ہے کہ وہ وکیل کے سامنے ان کے تشدد اور مطالبات کی قلعی کھول دے گا۔ مگر ظاہر وہ یہی

کرتے ہیں کہ اس قسم کی ملاقاتوں سے تفتیش متاثر ہوتی ہے۔

میں نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ "مجھے ملزم سے کوئی لمبی چوڑی میٹنگ نہیں کرنا ہے بادشاہو' بس وکالت نامے پر اس کے دستخط لینا ہیں۔"

وہ میرے داؤ میں نہیں آیا' روکھے پھیکے لہجے میں بولا۔ "انچارج صاحب کی اجازت نہیں ہے جناب!"

"وہ تو اس وقت کمرے میں نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"بس تو پھر آپ باہر بنچ پر بیٹھ کر انتظار کریں۔" وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "انچارج صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی کسی حوالاتی سے نہیں مل سکتا۔"

میں نے ترپ کا پتا پھینکا۔ "میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے۔ اس حوالے سے تو بارود خان سے ملاقات کی کوئی راہ نکالی جا سکتی ہے۔"

"کیا آپ نے کسی قانون کی کتاب میں یہ فلسفہ پڑھا تھا؟" اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

میں نے خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ "ہاں' وہ کوئی قانون ہی کی کتاب تھی۔"

"پھر تو آپ کو یہ بات معلوم ہو گی کہ آپ کون سی دفعہ کے تحت کسی حوالاتی سے ملنے کا حق رکھتے ہیں؟" اس کا انداز تمسخر اڑانے والا تھا۔

میں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں' معلوم ہے۔ دفعہ ایک سو' پی۔ پی۔ سی۔"

"جی!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ قانون کے بارے میں تو میں نے بھی بہت کچھ پڑھ رکھا ہے۔ پی۔ پی۔ سی کی دفعہ ایک سو تو ---"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا پھر ایک آنکھ دبا کر معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو انگشت شہادت کے ساتھ رگڑ کر اوپر کو اچھال دیا۔

اس کے چہرے پر خوشگوار تاثرات نمودار ہوئے۔ "یعنی' قائداعظم' زندہ باد!"
میں نے اثبات میں سرہلایا' اس نے پوچھا۔ "ذرا پی۔ پی۔ سی کی وضاحت کر دیں' یہ بات تو طے ہے کہ آپ کی مراد ہرگز ہرگز پاکستان پینل کورٹ (تعزیرات پاکستان) سے نہیں ہے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" میں نے کہا۔ "پی پی سی سے میری مراد' پبلک پرائیویٹ کمیشن ہے۔"

اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ "آپ مذاق بہت اچھا کرتے ہیں۔"

"یہ مذاق نہیں ہے۔" میں نے اپنی جیب میں پرس ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "قائداعظم صاحب بہت سے مسائل کا حل ہیں۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" ایس آئی جلدی سے بولا۔ "دین محمد آپ کے ساتھ جا رہا ہے۔ مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔" پھر اس نے آواز دے کر ایک پولیس اہلکار کو بلایا اور حکم دیا۔ "دین محمد! وکیل صاحب کو بچہ جمورا کے پاس لے جاؤ۔"

"جناب! وہی جو آدھا زمین کے اندر ہے؟" دین محمد کانسٹیبل نے پوچھا۔ "جو آدھا باہر ہے' بس اتنا ہی نظر آتا ہے۔"

"ہاں ہاں' وہی" ایس آئی نے کہا۔ "اور وکیل صاحب جو بھی پیغام دیں' وہ لے کر فوری طور پر میرے پاس آ جاؤ۔"

میں دین محمد کے ساتھ حوالات چلا گیا۔ راستے میں اسے میں نے سو روپے کا ایک سرخ نوٹ تھماتے ہوئے کہا تھا۔ "جلدی واپس آنے کی کوشش نہ کرنا۔" پھر میں نے بیس روپے اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بچوں کیلئے ربڑی کھیر وغیرہ لے جانا۔" وہ واقعی خوش ہو گیا۔

بارود خان کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ واقعی گیارہ بارہ سال سے زیادہ کا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت کھیل رہی تھی۔ وہ بچہ جسے کسی اسکول کا طالب علم ہونا چاہئے تھا' اس وقت حوالات کے ننگے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ وہ اپنے چہرے کو حرکت دیئے بغیر چاروں جانب دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک

چالاک اور ہوشیار لڑکا تھا۔ شکل صورت کے اعتبار سے وہ ایک دبلا پتلا' قبول صورت لڑکا تھا۔ ورنہ پٹھان بچے عام طور پر خوبصورت ہوا کرتے ہیں۔

میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔ میں ایک وکیل ہوں۔ تمہارا باپ دن میں میرے پاس آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی اول خان بھی تھا۔ ان کی زبانی مجھے تمہارے حالات کا کچھ علم تو ہوا ہے مگر یہ معلومات ناکافی ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں باعزت بری کرواؤں تو سب کچھ مجھے سچ سچ بتا دو۔"

"ام آپ کو سب کچھ بتائے گا' پہلے امارا ضمانت کا بندوبست کرو۔" اس کے لہجے کی بے خوفی مجھے حیران کر رہی تھی۔ ایک حوالاتی اور نوعمر حوالاتی اتنی بہادری کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ "پولیس نے تمہارا سات روز کا عدالتی ریمانڈ لے رکھا ہے۔ یہ سات دن تو تمہیں حوالات میں ہی گزارنا ہوں گے۔ جب پولیس تمہیں عدالت میں پیش کرے گی تو میں تمہاری ضمانت کروانے کی کوشش کروں گا۔"

"بس تو پھر آپ عدالت میں ہی آ کر ام سے ملیں' ابی کیا پائدہ اے؟"

میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "بارود خان! جب تک تم مجھے حالات کی حقیقت سے آگاہ نہیں کرو گے' اس وقت تک میں تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔ میں تمہارا وکیل ہوں۔ مجھ سے کچھ چھپاؤ مت۔ ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤ' میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ خلاؤں میں گم ہوتے ہوئے بولا۔ "اب کیا پائدہ۔۔ پلوری نئیں رہا۔۔۔"

اس کی آواز دور' بہت دور سے آ رہی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس کے چہرے پر ہیجان خیز تاثرات ابھر آئے۔ پھر وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔ "ام نئیں چوڑے گا۔ اس موٹے سور کو نئیں چوڑے گا۔" پھر وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ شاید وہ میرے آرپار دیکھ رہا تھا۔

بارود خان کی آواز' انداز اور عزائم سے میں نے اندازہ لگایا کہ مقتول فلوری سے اس کی کوئی نہ کوئی جذباتی وابستگی ضرور تھی اور موٹے سور سے اس کی مراد یقینی

طور پر فرید الدین۔۔ ہی تھا۔ اس سے ایک بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ ملزم نے کچھ عرصہ "فائیو اسٹار" میں بطور پیون ملازمت بھی کی تھی۔ یہ بات قابل غور تھی۔ حوالات کی طرف جلد کسی کے آ جانے کی امید نہیں تھی اس لئے میں نے کرید کرید کر بارود خان سے ساری تفصیلات معلوم کر لیں۔ اس کی پوری کہانی سننے کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قتل اس نے نہیں کیا تھا بلکہ اسے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پھانسا گیا تھا۔ بارود خان سے نصف گھنٹے کی ملاقات کے بعد مجھے جو تفصیلات حاصل ہوئیں' ان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ بہت سی کار آمد باتوں اور اہم نکات کا انکشاف میں عدالت کے کمرے میں ہی کروں گا۔

○

بارود خان نے ساتویں کلاس میں تقریباً سات بار فیل ہونے کے بعد عملی زندگی میں "قدم" رکھا۔ اس وقت وہ اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا۔ ابتدا میں اس نے شیر شاہ میں اسپیر پارٹس کی ایک دکان پر لوڈنگ ان لوڈنگ کا کام کیا۔ منہ سر اور کپڑے کالے ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کام اس کی بساط سے باہر ثابت ہوا۔ اس کا ناتواں جسم اس مشقت کا متحمل نہ ہو سکا۔ ناچار ایک ماہ بعد ہی اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اب اس کی منزل رنچھوڑ لائن میں واقع ایک برف خانہ تھا۔ یہاں پر کام کرتے ہوئے اگرچہ ہاتھ پاؤں تو صاف رہتے تھے مگر یہ بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ چند روز ہی میں وہ بے بس ہو گیا۔ بہ حالت مجبوری اسے یہ نوکری بھی چھوڑنا پڑی۔

عملی زندگی کی سختیوں سے واسطہ پڑا تو تعلیم کی قدر و قیمت کا اسے احساس ہوا مگر پڑھنا لکھنا اس کے اختیار میں کب تھا۔ اگر اس کا پڑھائی میں دل ٹھکا ہوتا تو آج وہ گریجویشن کر چکا ہوتا یا ایک آدھ سال میں کر لیتا۔ چند روز بے کار و بے روزگار پھرنے کے بعد آخر کار اسے ڈھنگ کی ایک ملازمت مل ہی گئی۔ "چغتائی ٹریڈرز" میں وہ پیون بھرتی ہو گیا۔ تنخواہ ایک ہزار روپے ماہوار اور کام انتہائی ہلکا پھلکا اور آسان۔

اس نے سکھ کی سانس لی اور مطمئن ہو کر کام میں جت گیا۔

چغتائی ٹریڈرز دراصل ریڈی میڈ گارمنٹس اور ٹیکسٹائل پروڈکٹس کی برآمد کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ انڈنٹنگ کا کام بھی کرتے تھے یعنی اپنا ایک مخصوص کمیشن لینے کے بعد دوسری چھوٹی کمپنیوں کا مال بھی برآمد کرتے تھے۔ چغتائی ٹریڈرز کا دفتر بھی اسی بلڈنگ میں تھا جہاں سے اخبار فائیو اسٹار نکلتا تھا بلکہ یہ دونوں دفتر آمنے سامنے تھے۔ آپ اس کثیر المنزلہ بلڈنگ کا نام اسٹار پلازا فرض کر لیں۔ میں اس بلڈنگ کا اصل نام آپ کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ اس سے بہت سے لوگوں کی اصلیت کھل جانے کا اندیشہ ہے۔

اسٹار پلازا پرانی طرز کی بلڈنگ تھی یعنی ہر فلور پر کمروں کے آگے بالکونی موجود تھی۔ فائیو اسٹار اور چغتائی ٹریڈرز کے دفتر چونکہ ایک ہی فلور پر تھے اور آمنے سامنے بھی تھے اس لئے ایک دفتر کی بالکونی میں کھڑے ہو کر بہ آسانی دوسرے دفتر میں آنے جانے والوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ بارود خان کو چغتائی ٹریڈرز میں کام کرتے ہوئے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ فائیو اسٹار کے اسٹاف میں ایک خوش گوار اضافہ ہوا۔ تیکھے نقوش والی سانولی سلونی فلوری کی آمد نے بلڈنگ میں ہلچل مچا دی۔ اس بلڈنگ کے مختلف دفاتر میں اور بھی لڑکیاں کام کرتی تھیں مگر فلوری کی بے باکی اور متوالی چال ڈھال نے سب کو اس پر توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ اکثر و بیشتر اسکرٹ اور بلاؤز میں آفس آتی تھی یا پھر سلیولیس شرٹ اور چست پتلون اس کا مرغوب پہناوا تھا۔ اس پر پنسل ہیل کی کھٹ کھٹ گویا من چلوں کے دلوں پر دستک دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر آہیں بھرنے اور دل مسوس کر رہ جانے والوں کی تعداد کم نہ تھی۔

بارود خان کا شمار بھی انہی افراد میں ہوتا تھا۔

شروع شروع میں کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔ ایک تو شکل ہی سے وہ بچہ دکھائی دیتا تھا۔ دوسرے اس کی حیثیت نے کسی کو اس پر دھیان دینے کا موقع نہیں دیا مگر جب وہ اکثر و بیشتر گیلری میں ٹہلتا ہوا پایا جانے لگا تو سب کی سمجھ میں آ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ فلوری نے اگرچہ کبھی بارود خان پر توجہ نہیں دی تھی مگر وہ جی جان سے اس پر نثار ہو چکا تھا۔ فلوری کی قربت حاصل کرنے کیلئے اس نے ایک

عجیب و غریب فیصلہ کیا۔ اس نے چغتائی ٹریڈرز کی ملازمت چھوڑ کر فائیو اسٹار میں نوکری کر لی۔ اگرچہ فائیو اسٹار میں اسے ایک ہزار روپے کے بجائے آٹھ سو روپے میں ملازمت ملی تھی مگر فلوری کے نزدیک رہنے کی خاطر اس نے دو سو روپے کا نقصان برداشت کر لیا تھا۔ فائیو اسٹار میں نوکری کیلئے بارود خان نے بڑی تگ و دو کی تھی۔ پہلے اس نے فائیو اسٹار کے آؤٹ ڈور پیون نصیبت خان سے یاری گانٹھی۔ ایک پٹھان بھائی نے دوسرے پٹھان بھائی سے بھرپور تعاون کیا اور نتیجے کے طور پر بارود خان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

وہ بہت خوش تھا۔ وہ اپنے دفتری فرائض بڑی تندہی سے انجام دے رہا تھا۔ فلوری پر تو وہ خاص طور پر مہربان تھا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے بھاگ بھاگ کر اس کا کام کرتا تھا۔ فلوری کے پاس بارود خان کی ان خدمات کا صلہ "تھینک یو" کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اسے اپنے باس ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی' بارود خان کے نازک احساسات کو سمجھنے کا وقت کہاں سے لاتی۔ بارود خان فلوری کی محبت میں سرتاپا ڈوب چکا تھا۔ اس کے پٹھان خون کو ابال آ ہی گیا۔ اتفاق سے اس دن باس بھی دفتر میں موجود نہیں تھا۔ بارود خان فلوری کو چائے دینے گیا تو اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ فلوری کا کیبن نما کمرا فرید الدین--- کے کمرے سے پہلے پڑتا تھا یعنی فلوری کے کمرے سے گزرنے کے بعد باس اپنے کمرے میں جاتا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ فلوری فرید الدین کی سیکریٹری تھی۔

فلوری اس وقت ایک لیٹر ٹائپ کر رہی تھی۔ اس نے چائے کا گھونٹ لینے کے بعد پوچھا۔ "کیا بات ہے خان! تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ وہاٹس پرابلم؟"

بارود خان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہ کیا کہے۔ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر فلوری نے کہا۔ "پیسوں کی ضرورت ہے کیا؟"

فلوری نے بارود خان کی متذبذب خاموشی کو غلط رنگ دے دیا تھا۔ بارود خان کی غیرت نے جوش مارا۔ "نئیں میڈم صیب' ام پیسوں کیلئے اور نئیں بیٹھا اے۔"

"دین وہاٹس رانگ ودھ یو؟" وہ بدستور ٹائپ کرتے ہوئے بولی۔ "پھر کیا مسئلہ ہے بارود خان؟"

وہ لفظوں کا قیمہ بناتے ہوئے بولا۔ "ام آپ سے ایک بوت ضروری بات کرنے آیا اے۔"

فلوری کی انگلیوں کو بریک لگ گئی۔ اس نے گردن موڑ کر بارود خان کی جانب دیکھا پھر بولی۔ "ہاں کہو' میں سن رہی ہوں۔ وہاٹ ڈو یو وانٹ ٹو سے؟"

بارود خان گڑبڑا گیا۔ "وہ--- وہ---" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کوئی بات نئیں اے میڈم! ام تو--- ام تو---"

اتنا کہہ کر وہ جانے لگا تو فلوری نے اسے آواز دے کر روک لیا پھر پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ "بارود خان! ادھر آ کر بیٹھو اور مجھے بتاؤ' تم مجھ سے کون سی ضروری بات کرنا چاہتے تھے۔ آئی وانٹ ٹو نو ایوری تھنگ۔ او کے!"

فلوری کے دوستانہ انداز نے اس کی ہمت بندھائی۔ اس کا حوصلہ بڑھا تو وہ قدرے اعتماد سے بولا۔ "میڈم صیب! آپ کو امارا بات برا تو نئیں لگے گا؟"

"ناٹ ایٹ آل۔" وہ اس کی سادگی پر مسکرائی۔ "تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو' بلا خوف و خطر کہہ ڈالو۔"

بارود خان نے کہہ ڈالا۔ "میڈم صیب! آپ ام کو بہت اچھا لگتا ہے۔"

"سو وہاٹ!" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں تو بہت سے لوگوں کو اچھی لگتی ہوں۔ ڈونٹ بی سو وری اباؤٹ می۔"

وہ جزبز ہو کر بولا۔ "دوسرے لوگوں کا بات اور اے میڈم صیب!"

فلوری اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے بارود خان کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا بتاؤ' میں تمہیں کیوں اچھی لگتی ہوں' لیٹ می ایکس پلین پلیز؟"

"امارا بات مختلپ اے میڈم صیب!" وہ تھوک نگل کر بولا۔

"وہاٹس ڈیفرنٹ؟" فلوری نے بدستور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری بات مختلف کیوں ہے؟"

"ام آپ سے محبت فرماتا اے۔"

فلوری نے بے اختیار ایک قہقہہ لگایا پھر ہنستے ہوئے بولی۔ "محبت--- یو مین

لو۔۔۔ہاؤ کریزی یو آر!"

بارود خان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ فلوری اس کی محبت کا اس طرح مذاق اڑائے گی۔ حالانکہ فلوری مذاق نہیں اڑا رہی تھی بلکہ وہ اس کی جسارت پر اظہار حیرت کر رہی تھی لیکن اس کا ہنسا اور قہقہے لگانا بارود خان کو ذہنی اذیت سے دوچار کر رہا تھا۔ وہی یہی سمجھ رہا تھا کہ فلوری نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس وقت اس کا دل لہو ہو رہا تھا۔ جس کی محبت میں وہ دن رات پکتا رہا تھا' وہ اس کے اظہار محبت کو اتنے غیر سنجیدہ انداز میں لے رہی تھی۔ اس کا جی بھر آیا پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میڈم صیب' ام خدا پاک کا قسم کھا کر کہتا اے' ام آپ سے بوت محبت کرتا ہے۔ اگر آپ ایں نہ ملا تو ام اپنی جان دے دے گا۔ ام خودکشی کر لے گا۔"

فلوری نے پہلی مرتبہ سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر ناگواری سے بولی۔

"آر یو گوئنگ ٹو بی میڈ؟ مجھے لگتا ہے' تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے' اسی لئے بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

"یہ بہکی بہکی باتیں نئیں اے' میڈم صیب!" وہ قطعیت سے بولا۔ "ایک نہ ایک دن آپ کو امارا محبت کا یقین ضرور آ جائے گا۔"

"شٹ یور ماؤتھ اینڈ گیٹ لاسٹ!" وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "اگر تم نے اب کوئی بکواس کی تو میں باس سے تمہاری شکایت کر دوں گی' جاؤ یہاں سے اور میری اجازت کے بغیر میرے کمرے میں قدم نہ رکھنا۔"

وہ تھوڑی دیر تک دزدیدہ نظروں سے اپنے سنگ دل محبوب کو دیکھتا رہا پھر آئینہ دل کی کرچیوں کو سمیٹ کر وہاں سے واپس آ گیا۔ فلوری نے بری طرح دھتکار کر اسے اپنے کمرے سے نکال دیا تھا مگر وہ فلوری کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس بات کو وہی لوگ صحیح معنوں میں محسوس کر سکتے ہیں جن کے دل کی دھڑکن کسی اور کی یاد کی مرہون منت ہو۔

فلوری نے پہلی فرصت میں یہ واقعہ مزے لے لے کر اپنے باس کو سنایا۔

دوسرے روز بارود خان دفتر پہنچا تو اس کی پیشی ہو گئی۔ وہ فرید الدین۔۔۔ کی خدمت

میں حاضر ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے کیوں طلب کیا گیا تھا۔ بند کمرے کی خاموشی میں فرید الدین کی آواز گونجی۔ وہ انتہائی غصیلے لہجے میں بارود خان سے استفسار کر رہا تھا۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ کل تم نے مس فلوری سے بدتمیزی کی ہے؟"

صورتحال کی وضاحت ہوتے ہی بارود خان محتاط ہو گیا۔ وہ بے خوفی سے بولا۔

"صیب' آپ کو یہ بات کس نے بتایا؟"

"تم میری بات کا جواب دو۔" فرید الدین دہاڑا۔

بارود خان اپنے باس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے گویا ہوا۔ "ام نے میڈم کے ساتھ کوئی بدتمیزی نئیں کیا سر۔ آپ چاہے' ان کو یہاں بلا کر پوچھ لیں۔"

"میں نے سنا ہے تو ٹھیک ہی سنا ہو گا۔" فرید الدین نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔ تم سچ سچ بتاؤ' تم نے کل مس فلوری سے اظہار محبت نہیں کیا تھا؟"

"کیا تھا' ام نے کیا تھا۔" بارود خان نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "ام نے میڈم کو بتایا تھا کہ ام اس کو بوت چاہتا اے' اس سے سچا محبت کرتا ہے لیکن ام نے کوئی بدتمیزی نئیں کیا۔ آپ چاہیں تو میڈم کو بلا کر۔۔۔"

فرید الدین اس کی بات قطع کرتے ہوئے بولا۔ "او جاہل کی اولاد! میں اسی بدتمیزی کی بات کر رہا ہوں۔"

"یہ بدتمیزی نئیں اے صیب!" بارود خان نے بپھرے ہوئے انداز میں ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "محبت کرنا بدتمیزی کیسے او سکتا اے۔ محبت تو خدائی جذبہ اے۔ خدا اپنے بندوں سے محبت فرماتا اے' آپ اتنا بڑا صیب اے' بوت پڑھا لکھا اے' ایک اخبار نکالتا اے۔ آپ کو یہ چوٹا سا بات مالوم نئیں اے۔"

فرید الدین لاجواب ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا پھر اپنی جھینپ مٹانے کی خاطر کہا۔ "یہ تمہاری پہلی غلطی ہے اس لئے میں معاف کرتا ہوں۔ آئندہ مجھے ایسی شکایت نہ ملے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

بارود خان نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا چاہا مگر فرید الدین نے اسے ہاتھ کے

اشارے سے منع کر دیا پھر خود کہا۔ ''اب تم جاؤ۔ مجھے بہت ضروری کام کرنا ہیں۔''

بارود خان منہ لٹکائے ہوئے باس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

فلوری نے اسی شکایت پر بس نہیں کی تھی بلکہ اسٹاف کے دیگر ممبران کو بھی چسکے چسکے یہ واقعہ سنا دیا اور ذرا مرچ مسالا لگا کر۔ نصیبت خان کے سوا ہر شخص بارود خان کا مذاق اڑانے لگا۔ ہر کوئی گاہے بگاہے فلوری کے حوالے سے اسے چھیڑتا۔ ایک حد تک وہ برداشت کرتا رہا پھر جذبات کے جوش میں آ کر وہ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ اس قسم کی غیر محتاط گفتگو اس کیلئے مصیبت بن گئی۔

''ام ہر قیمت پر فلوری میڈم کو حاصل کر کے رہے گا۔''

''ام اپنے راستے کا ہر رکاوٹ کو ٹوکروں میں اڑا دے گا۔''

''اگر باس نے گڑبڑ کیا تو ام اس موٹے کا پیٹ پاڑ دے گا۔''

''فلوری ام کو نہ ملا تو ام اپنی جان قربان کر دے گا۔''

اور اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں۔ لوگ تو مزے لینے کیلئے اسے چھیڑتے تھے لیکن وہ احمق ان کی چال نہیں سمجھتا تھا۔ یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔ ''منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات'' کے مصداق' بارود خان کے عزائم کی خبر جلد ہی فرید الدین کو ہو گئی۔ نتیجے کے طور پر بارود خان کو فائیو اسٹار کی نوکری سے نکال دیا گیا۔ وہ فلوری کی یاد کو دل میں بسا کر وہاں سے چلا آیا۔ ایک عاشق ناشاد کی طرح' ایک خانماں برباد کی طرح۔

مہینہ دس دن کی آوارہ گردی کے بعد اس نے ایک ایرانی ریستوران میں نوکری کر لی۔ یہ ریستوران اسٹار پلازا سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس ریسٹورنٹ کو اس نے اس لئے بھی ترجیح دی تھی کہ ہو سکتا تھا' اتنا قریب رہتے ہوئے کبھی فلوری کی جھلک دکھائی دے جائے بلکہ اس نے یہاں تک انتظام کر لیا تھا کہ باہر کے آرڈر لے کر جانے والے ویٹر کو اپنی راہ میں ہموار کر لیا تھا۔ اگر اسٹار پلازا میں کچھ لے کر جانا ہو گا تو جمیل کی جگہ وہ خود جائے گا۔ جمیل بہ آسانی راضی ہو گیا۔ دیدار یار کے لئے کیسے کیسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بارود خان کو اس ریسٹورنٹ میں کام کرتے ہوئے دو ماہ گزر گئے مگر ایک مرتبہ بھی اسے فلوری کی صورت نظر نہ آئی۔ وہ قریب

قریب مایوس ہو چلا تھا کہ ایک دوپہر اسے اسٹار پلازا میں جانے کا موقع مل گیا۔۔ اور وہ بھی تھرڈ فلور پر۔۔ اور سب سے مزے کی بات یہ تھی کہ کھانے کا وہ آرڈر فائیو اسٹار کے باس فرید الدین۔۔ کا تھا۔ وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ اس کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔

مگر اسی روز فلوری کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو گیا۔

○

وقوعہ کے روز پیش آنے والے واقعات (جن کا ذکر آگے چل کر مناسب موقع پر عدالتی کارروائی کے دوران میں کیا جائے گا) کی تفصیلات سننے کے بعد میں نے بارود خان سے وکالت نام پر دستخط کروائے پھر کاغذات کو بریف کیس میں رکھنے کے بعد پوچھا۔

''تم نے پولیس کو کیا بیان دیا ہے بارود خان؟''

وہ سادگی سے بولا۔ ''وہی جو وہ اماری زبان سے سننا چاہتا تھا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم نے اقرار جرم کر لیا ہے؟''

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''اس سے کوئی پرق نئیں پڑتا وکیل صیب۔'' ام کو مالوم اے' پولیس کی تحویل میں کئے گئے اقبال جرم کی عدالت میں کوئی اہمیت نئیں ہوتی۔ ام اور جج کے سامنے صحت جرم سے انکار کر دے گا۔''

میں اس کی معلومات پر حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا پولیس والوں نے تم سے کسی کاغذ وغیرہ پر دستخط بھی لئے ہیں؟''

''ہاں' دستخط بھی کیا اے ام نے۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''امیں پکا یقین اے وکیل صیب' وہ کاغذ ماغذ امارے جرم کا اقرار ہو گا پر ام کو کوئی پکر نئیں اے۔''

میں نے پوچھا۔ ''پولیس والوں نے تم پر کوئی تشدد وغیرہ تو نہیں کیا؟''

''ام نے اس تکلف کا موقع ہی نئیں دیا۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''ام نے

خودبخود ان کا کام آسان کر دیا۔ اگر ام ذرا اڑی مڑی کرتا تو یہ کاپر کا بچہ ایں مار مار کر چکی والا دنبہ بنا دیتا۔ ام آپ کو شکل سے کوئی بے وقوف نظر آتا اے وکیل صیب؟؟"

وہ مجھے بار بار حیران کر رہا تھا۔ وہ خاصا چلتا پرزہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے سوال کا آسان سا جواب تو یہ تھا کہ وہ ہرگز ہرگز بے وقوف نہیں تھا حالانکہ شکل سے نرا احمق نظر آتا تھا مگر اندر سے پورا تھا۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

"بارود خان! کیا تم پہلے بھی کبھی تھانے آ چکے ہو؟"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "ماں قسم وکیل صیب' یہ پہلا موقع اے۔"

"پھر تمہیں تھانے کچہری کی اتنی معلومات کیسے ہیں؟"

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "ام پالتو وقت میں مطالعہ فرماتا اے۔ اور سسپنس ڈائجسٹ میں ایک وکیل صیب کا بڑا ٹائٹ کہانی چھپتا اے۔ ام نے یہ ساری باتیں وہاں سے سیکھا اے۔ ام وہ کہانی بوت شوق سے پڑھتا اے۔ وکیل صیب کا نام بڑا مشکل اے۔ ام نے کوشش کیا مگر بھول جاتا اے' نام یاد نئیں۔"

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے آتے ہی بارود خان کو اپنا نام بتا کر تعارف کروایا تھا ممکن تھا اس نے سنا ہی نہ ہو یا میرے اس جملے پر توجہ نہ دی ہو ورنہ وہ میرا نام سنتے ہی چونک ضرور جاتا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس وکیل صاحب کا نام مرزا امجد بیگ تو نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں' یہی اے۔ بڑا لش پش کہانی لکھتا اے۔" بارود خان نے جلدی سے کہا۔ "وکیل صیب' آپ اس کو جانتا اے؟" پھر وہ افسوسناک انداز میں پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ "پتا نئیں' امارے دماغ کو کیا ہو گیا اے۔ آپ بھی وکیل اے' وہ بھی وکیل۔ ایک دوسرے کو ضرور جانتا ہو گا۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ہی وہ وکیل ہوں۔۔ مرزا امجد بیگ۔"

وفور مسرت سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ جذبات میں بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔ "امارا قسمت جاگ گیا اے۔ اب ام کو سو فیصد یقین اے کہ ام بری ہو

جائے گا۔ ماں قسم' اس وقت امارا دل چاہتا اے ام ادھر حوالات میں ہی خوشی سے ناچنا شروع کر دے۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنے نیک جذبات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا' میں نے اسے ٹوک دیا۔ "اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو بارود خان!" میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ "یہ تھانہ ہے جب تم باعزت بری ہو جاؤ گے تو دل کھول کر گلی گلی خٹک ناچ کا مظاہرہ کرنا۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ فوری طور پر شانت ہو گیا۔ میں اسے تسلی دینے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ پیر کے روز حسب وعدہ وقت مقررہ پر اول خان اور بندوق خان میرے دفتر میں موجود تھے۔

میں نے انہیں خوشخبری سناتے ہوئے کہا۔ "بندوق خان' میں نے تمہارے بیٹے کا کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے وکیل صیب!" بندوق خان دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھاتے ہوئے بولا۔

میں نے اول خان سے کہا۔ "اس سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی سخت ضرورت ہے خان صاحب!"

"ام ہر طرح کا تعاون کرے گا۔ آپ جو بولے گا' ام وہی کرے گا۔"

میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ بارود خان کی ضمانت کے لئے رقم کا بندوبست کرنا ہو گا۔"

"رقم مقم کا فکر نئیں کرو وکیل صیب!" اول خان نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ام کرے گا انتظام' بولو کتنا رقم چاہئے۔"

میں نے اسے ایک مناسب فگر بتا دیا پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ مجھے اور بھی بہت سی معلومات درکار ہیں۔ آپ کو تھوڑی سی محنت تو کرنا پڑے گی لیکن اس سے کیس میں بہت مدد ملے گی۔ ہم سب کو مل جل کر مختلف محاذوں پر لڑنا ہو گا۔ میں عدالت اور قانون کو دیکھوں گا' آپ اس دوران میں میری مطلوبہ معلومات اکٹھا کر لیں۔"

وہ بڑی توجہ سے میری بات سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ تفہیمی انداز میں سر بھی ہلاتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے فرید الدین۔۔ مقتولہ فلوری اور فائیو اسٹار کے آؤٹ ڈور کلرک نصیبت خان کے بارے میں خصوصی معلومات جمع کرنے کی ہدایت کی بلکہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتا بھی دیا کہ مجھے کس نوعیت کی معلومات درکار ہیں۔ ایسی ہدایات میں نے بارود خان کی فراہم کردہ اطلاعات کی بنا پر دی تھیں۔ اپنی بات ختم کرنے کے بعد میں نے تاکید کی۔

"مگر یہ سب کچھ بہت جلد ہو جانا چاہئے۔ پولیس کے چالان پیش کرنے سے پہلے ہمیں اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانا ہے۔"

اول خان مجھ سے وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

دو روز بعد وہ پھر میرے پاس آیا اور میری توقع سے کہیں زیادہ اہم اطلاعات کے ساتھ۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں کیس کی ابتدائی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

○

پولیس نے ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد چالان پیش کر دیا۔

پولیس رپورٹ میں واضح طور پر یہ بات درج تھی کہ ملزم اپنے جرم کا اقرار کر چکا ہے اور اس نے اس بات کی بھی تصدیق کر دی ہے کہ جس ریوالور سے قتل کی واردات ہوئی' وہ اسی کی ملکیت تھا۔ وجہ قتل انتقام کو بتایا گیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل مقتولہ فلوری نے ملازم بارود خان کو بری طرح بے عزت کیا تھا بلکہ اسے نوکری سے بھی نکلوا دیا تھا۔ ملزم انتقام لینے کیلئے موقع کا انتظار کرتا رہا پھر موقع ملتے ہی اس نے فلوری کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

پولیس نے واردات کا جو نقشہ بیان کیا تھا' وہ کچھ اس طرح سے تھا۔ ملزم انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے پاس ایک بھرا ہوا ریوالور رکھتا تھا۔ وقوعہ کے روز اسے انتقامی کارروائی کا بڑا مناسب موقع مل گیا۔ وہ کھانے کی ٹرے میں

ریوالور رکھ کر فائیو اسٹار کے دفتر میں پہنچ گیا۔ دوپہر کے وقت عام طور پر دفتر میں بہت کم اسٹاف ہوتا تھا۔ وہ شام کا اخبار تھا جہاں علی الصباح کام کا آغاز ہو جاتا تھا اور کاپی پریس میں جانے کے بعد ایک دو اہم افراد کے سوا باقی اسٹاف چھٹی کر جاتا تھا اور یہ معمولات ملزم بہ خوبی جانتا تھا کیونکہ وہ اس دفتر میں کام کر چکا تھا۔ ملزم حسب پروگرام کھانے کی ٹرے لے کر فرید الدین۔۔ کے دفتر میں پہنچ گیا۔ اسے اس بات پر حیرت ہوئی کہ دفتر میں اس وقت فلوری کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ فلوری صوفے پر نیم دراز تھی۔ اس سے اچھا موقع اسے پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر ٹرے سے ریوالور نکال لیا۔ اس سے پہلے وہ ٹرے کو میز پر رکھ چکا تھا۔ اس سے قبل کہ فلوری صورتحال کی سنگینی کو سمجھ پاتی' ملزم نے یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ گولیاں فلوری کے سینے میں لگیں۔ اس کے وجود کو دو جھٹکے لگے اور وہ وہیں ٹھنڈی ہو گئی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد بارود خان نے ریوالور کو وہیں پھینکا اور میز پر سے فرید الدین کی نیو برانڈ ویسٹ اینڈ واچ گھڑی اٹھا کر رفوچکر ہو گیا۔

جس وقت ملزم نے فائرنگ کی' اس وقت فرید الدین اٹیچڈ باتھ روم میں ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ باہر کو لپکا مگر اس اثنا میں ملزم اپنا کام کر کے وہاں سے نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ میز پر رکھی کھانے کی ٹرے دیکھ کر فرید الدین سمجھ گیا کہ یہ سب کیا دھرا کھانا لانے والے لڑکے کا ہی ہو سکتا ہے پھر اس نے میز پر سے اپنی گھڑی کو بھی غائب پایا۔ اس کے بعد ہی اس نے قریبی پولیس اسٹیشن فون کر کے اس واردات کی اطلاع دے دی۔ پولیس کچھ ہی دیر بعد موقع واردات پر موجود تھی۔ پھر فرید الدین کی رہنمائی میں پولیس نے مذکورہ ایرانی ہوٹل میں چھاپہ مار کر ملزم بارود خان کو گرفتار کر لیا۔ اس کے پاس سے فرید الدین کی ویسٹ اینڈ واچ بھی برآمد ہو گئی تھی۔ پولیس اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

پولیس رپورٹ دروغ گوئی کا پلندا تھی۔ بارود خان کی زبانی مجھے جو واقعات معلوم ہوئے تھے' وہ اس سے یکسر مختلف تھے۔ ایک بات میں شاید آپ کو بتانا بھول گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ فلوری کی موت دوپہر ایک اور دو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر گولیوں کے دو نشانات پائے گئے تھے۔

ایک گولی عین دل میں پیوست ہو گئی تھی' دوسری گولی نے ایک پھیپھڑے کو چیر ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ مقتولہ کے سر پر کسی ٹھوس اور نوک دار چیز کی چوٹ کا نشان بھی پایا گیا تھا تاہم رپورٹ میں موت کا سبب دل میں گھسنے والی گولی کو ہی بتایا گیا تھا۔ دونوں گولیاں اعشاریہ تین دو کیلی بر کے ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ موقع واردات سے جو ریوالور ملا تھا وہ بھی مذکورہ کیلی برکا ہی تھا۔ اس کے علاوہ کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ مقتولہ کے جسم سے برآمد ہونیوالی گولیاں موقع واردات سے ملنے والے ریوالور ہی سے چلائی گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں جو سب سے زیادہ حیرت انگیز انکشاف کیا گیا تھا' وہ یہ تھا کہ مقتولہ فلوری دو ماہ کی حاملہ تھی۔

جبکہ زندگی کی آخری سانس تک وہ مصدقہ طور پر غیر شادی شدہ تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں کہیں بھی فنگر پرنٹس وغیرہ کا ذکر نہیں تھا۔ مجموعی طور پر یہ رپورٹ میرے موکل کے حق میں جاتی تھی۔

پولیس کے چالان پیش کرنے کے بعد دو ماہ عدالت کی ابتدائی کارروائیوں کی نذر ہو گئے۔ باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا تو جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ جواب میں میرے موکل نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے بتایا کہ پولیس نے زبردستی اسے ڈرا دھمکا کر اقرار جرم کروا لیا تھا حالانکہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے کسی سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بارود خان کی درخواست ضمانت جج کے سامنے پیش کر دی پھر کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میرا موکل بے قصور ہے۔ اس کی معصومیت اور سادگی سے فائدہ اٹھا کر کسی نے اسے قتل کی اس گہری سازش میں پھانسنے کی کوشش کی ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میرے موکل کی ضمانت کو منظور کرتے ہوئے انصاف کے تقاضے پورے کئے جائیں۔“

وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ ”یور آنر! ملزم کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے منافی ہو گا۔ اس نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے اور پولیس کی تحویل میں اس نے اپنے اس جرم کا اقبال بھی کیا ہے۔“

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یور آنر! معزز عدالت بخوبی یہ بات جانتی ہے کہ پولیس کسٹڈی میں دیئے گئے بیان کی عدالت میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ پولیس والوں کے ظلم و ستم اور تشدد کی داستان کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ پولیس والوں کی ”کارکردگی“ کے سامنے تو مردے بھی بولنے لگتے ہیں۔“ میں نے کن انکھیوں سے انکوائری افسر کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! عدالت صرف ٹھوس ثبوت اور معزز شہادتوں کو اہمیت دیتی ہے۔ میں اس عدالت میں۔۔۔“

وکیل استغاثہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یور آنر! میرے فاضل دوست نے ٹھوس ثبوت اور معزز گواہوں کا ذکر کیا ہے۔ پولیس چالان میں وہ تمام ثبوت موجود ہیں جو ملزم بارود خان کو مجرم ثابت کرتے ہیں اور وقت آنے پر معزز گواہ بھی پیش کر دیئے جائیں گے۔“

”میں بھی یہی عرض کر رہا ہوں مائی ڈیئر کونسلر!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہر کام اپنے اپنے وقت پر ہو جائے گا۔“ پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”یور آنر' میرا موکل انتہائی بے ضرر اور معصوم انسان ہے۔ یہ کسی بھی طور استغاثہ کے گواہوں یا عدالتی کارروائی پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں پرزور اپیل کرتا ہوں کہ میرے موکل کو ضمانت پر یا ذاتی مچلکے پر رہا کر دیا جائے۔“

”بہت خوب۔“ وکیل مخالف نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”یور آنر! وکیل صفائی کی نظر میں ملزم بارود خان ایک بے ضرر اور معصوم انسان ہے۔ قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والا شخص بے ضرر کیسے ہو سکتا ہے جناب عالی! اور۔۔۔ اس کا تو نام ہی اتنا خطرناک ہے کہ خدا کی پناہ۔۔۔! اس کے بعد وکیل استغاثہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”آبجیکشن یور آنر۔“ میں نے اپنے غصے پر ضبط کا بند باندھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔ ”میرے موکل کا جرم ابھی ثابت نہیں ہوا ہے لیکن میرے فاضل دوست میرے موکل کو بار بار ”قتل جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والا شخص“ کہہ

کر مخاطب کر رہے ہیں۔ کسی ملزم کو معزز عدالت کے سامنے مجرم کہہ کر زیر بحث لانا بجائے خود ایک جرم تصور کیا جاتا ہے۔ میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ وکیل استغاثہ کو ایسی حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"

جج نے ناگواری سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر تنبیہی لہجے میں کہا۔ "وکیل صاحب! آپ الفاظ کے چناؤ میں احتیاط برتیں۔"

"ایک بات اور جناب عالی!" میں نے دوبارہ جج کو مخاطب کیا۔ "میرے فاضل دوست سے پوچھا جائے کہ انہوں نے میرے موکل کے نام کے حوالے سے اپنے کانوں کو ہاتھ کیوں لگائے تھے؟"

جج نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ "آپ اپنے فعل کی وضاحت کریں۔"

وہ بولا۔ "یور آنر! بارود خان کسی بے ضرر شخص کا نام کیسے ہو سکتا ہے' بارود تو خاصی خطرناک چیز ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یور آنر' کسی شخص کا نام اس کے اعمال کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا۔ اس بات کو فارمولا بنا لینا انتہائی احمقانہ سوچ کا ثبوت ہے۔ کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ عابد نام کا کوئی شخص واقعی عبادت گزار بھی ہو گا یا زاہد نامی کوئی شخص متقی اور پرہیز گار ہو گا۔ جمیل نام کے کسی شخص کا حسین و خوب رو ہونا ضروری نہیں ہے' سلطان نامی ایک شخص معمولی مزدور بھی ہو سکتا ہے اور خادم نامی کوئی شخص انتہائی با اختیار و با اقتدار بھی ہو سکتا ہے لہٰذا بارود خان کو بارود کی وجہ سے خطرناک قرار دینا کسی طور پر بھی مناسب اور جائز نہیں ہے۔ نام عام طور پر قوم' تہذیب اور علاقائی خطے کی مناسبت اور مزاج کے مطابق رکھے جاتے ہیں۔ پٹھان قوم میں ولولہ' عزم اور جوش کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے اس لئے ان کے نام بھی خاصے دبنگ ہوتے ہیں مثلاً بارود خان' بندوق خان' شمشیر خان' اسلحہ خان' زلزلہ خان وغیرہ وغیرہ۔"

جج نے میری بات کے اختتام پر کہا۔ "آپ حضرات آپس میں الجھنے کے بجائے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھائیں۔" پھر اس نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی اور وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ "آپ کے پاس ضمانت روکنے کی ٹھوس وجوہات ہیں؟" اس کے بعد وہ میری جانب مڑا۔ "بیگ صاحب! آپ ضمانت کے حق میں کچھ اور کہنا چاہتے

ہیں؟"

وکیل استغاثہ کے جواب دینے سے پہلے میں بول اٹھا۔ "جناب عالی' اپنے موکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے میرے پاس دلائل کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے مگر میں اپنے دلائل وقت آنے پر ہی دوں گا۔ ابھی میری معزز عدالت سے بس اتنی درخواست ہے کہ میرے موکل کی ضمانت منظور کر لی جائے۔ سردست میں اتنا عرض کروں گا کہ میرا موکل ایک سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوا ہے۔ پولیس نے دانستہ بہت سی اہم باتوں کو نظر انداز کیا ہے۔ میں اپنی بات کی سچائی کے لئے تفتیشی افسر سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو!"

"یور آر پر میٹڈ۔" جج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

تفتیشی افسر ایک اے ایس آئی تھا۔ وہ جج کی اجازت کے بعد کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا۔ میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "اسسٹنٹ سب انسپکٹر صاحب! میں اپنی سہولت کیلئے آپ کو صرف انسپکٹر صاحب کہہ لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

وہ بیزار کن لہجے میں بولا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے' ویسے آپ مجھے میرے نام سے بھی پکار سکتے ہیں' میرا نام رانا شوکت ہے۔"

"رانا صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں۔ پولیس نے جو چالان عدالت میں پیش کیا ہے' اس کی جزئیات تو آپ کو ازبر ہوں گی؟"

"اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ آلہ قتل وقوعہ پر پڑا ہوا ملا تھا اور ملزم نے اس کی ملکیت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ مذکورہ ریوالور ملزم کی ہی ملکیت ہے؟"

"آپ خواہ مخواہ سیدھی سادی بات کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قتل اسی ریوالور سے کیا گیا ہے اور ملزم نے اپنے اقبالی بیان میں اس کی ملکیت کا اعتراف بھی کیا تھا مگر۔۔۔"

"مگر عدالت میں اس نے انکار کر دیا ہے؟" میں نے اس کے ادھورے جملے کو

مکمل کر دیا۔

وہ جلدی سے بولا۔ "مجرم خود کو بچانے کیلئے اس سے بھی عجیب کہانیاں گھڑنے کے ماہر ہوتے ہیں۔"

"مجرم نہیں، ملزم!" میں نے تصحیح کی۔ "ابھی تک میرے موکل کا جرم ثابت نہیں ہوا۔"

"میرا یہی مطلب تھا۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"رانا صاحب! آلہ قتل کے بارے میں آپ کی تفتیش کیا کہتی ہے؟"

اے ایس آئی رانا شوکت نے جواب دیا۔ "وہ درہ میڈ بتیس بور کا ریوالور ہے اور بغیر لائسنس کا غیر قانونی ہتھیار ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ ملزم نے واردات کے بعد آلہ قتل کو جائے وقوعہ پر کیوں چھوڑ دیا تھا جب کہ آپ کی رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ قتل کی یہ واردات سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی گئی ہے۔ کیا کوئی سوچا سمجھا منصوبہ اتنا ناقص ہو سکتا ہے کہ منصوبہ ساز پھانسی پر لٹکنے کا انتظام خود اپنے ہاتھوں کرے؟"

میں نے محسوس کیا کہ تفتیشی افسر میری جرح سے بے چینی محسوس کر رہا تھا جبکہ جج پوری دلچسپی سے میرے سوالات سن رہا تھا۔ تفتیشی افسر نے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ "مجرم سے اکثر ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔" میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن قانون اور قانون کے محافظوں سے ایسی غلطیاں سرزد نہیں ہونا چاہئیں۔"

پتا نہیں، وہ میری بات کو سمجھا بھی تھا یا نہیں۔ بہرحال اس نے غیر ارادی طور پر سوال کیا۔ "آپ کن غلطیوں کا ذکر کر رہے ہیں؟"

"پولیس کی تفتیشی غلطیاں۔"

"میں سمجھا نہیں!" وہ بری طرح الجھ چکا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر پریشانی نظر آ رہی تھی۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تفتیشی افسر صاحب! کیا آپ

عدالت کو بتائیں گے کہ آلہ قتل پر سے انگلیوں کے نشانات کیوں نہیں اٹھائے گئے۔ آئی مین فنگر پرنٹس کیونکہ چالان میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے؟"

"وارداتیا' گرفتار ہو چکا تھا اور اس نے اقبال جرم بھی کر لیا تھا اس لئے ہم نے فنگر پرنٹس اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"اپنی نالائقی کو چھپانے کیلئے بڑا بوگس جواز گھڑا ہے آپ نے۔" میں نے رانا شوکت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس صورت میں جب کہ میرا موکل جائے وقوعہ پر رنگے ہاتھوں نہیں پکڑا گیا تھا' یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ فنگر پرنٹس کے ذریعے اس بات کی تصدیق کی جاتی کہ آیا قتل اسی کے ہاتھوں سے ہوا تھا یا نہیں۔"

ایک لمحے کے بعد میں نے کہا۔ "بلکہ اس صورت میں تو آپ کو ملزم کے ہاتھوں کا کیمیائی تجزیہ بھی کروانا چاہئے تھا۔ جب کوئی شخص آتشیں ہتھیار استعمال کرتا ہے تو اس کے ہاتھ پر بارود کے غیر مرئی ذرات چپک جاتے ہیں جو کہ کیمیائی تجزیے میں پکڑے جا سکتے ہیں۔ یہ پیرافن ٹیسٹ (Paraffin Test) کہلاتا ہے۔ کیا آپ نے ملزم کے ہاتھوں کا پیرافن ٹیسٹ کروایا تھا؟"

وہ بے بسی سے بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔

"کہیں آپ کا یہ خیال تو نہیں تھا کہ بارود خان سرتاپا بارود ہے۔ اس کے ہاتھوں کے پیرافن ٹیسٹ سے بھلا بارود کے ذرات کی موجودگی کا کیا پتہ چلے گا؟" اپنی بات ختم کرنے کے بعد میں نے خاص طور پر وکیل سرکار کی جانب دیکھا۔

میری اس چوٹ پر انکوائری افسر تو خفیف ہوا ہی تھا لیکن میں نے دیکھا کہ وکیل استغاثہ بھی خجالت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے تفتیشی افسر پر ایک اور کاری وار کیا۔ میں نے کہا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتاتی ہے کہ مقتولہ دو ماہ کی حاملہ تھی جبکہ وہ غیر شادی شدہ لڑکی تھی۔ آپ کی تفتیش اس سلسلے میں کیا کہتی ہے؟"

"یہ سراسر مقتولہ کا ذاتی معاملہ تھا۔" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ "آپ مجھ سے اس بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"جناب تفتیشی افسر صاحب! میں آپ سے یہ بات اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ یہ ایک قابل دخل اندازی پولیس کیس ہے اور آپ اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں۔"

آپ کے خیال میں مجھے یہ سوال کس سے پوچھنا چاہئے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی' پولیس کے پیش کردہ چالان کی خامیاں معزز عدالت کے علم میں آچکی ہیں۔ عدالت اس بات سے اندازہ لگا سکتی ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے۔ اس کی مزید بے گناہی کو میں استغاثہ کے گواہوں پر جرح کے دوران میں ثابت کروں گا۔ فی الحال' میں ایک مرتبہ پھر معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے موکل کی ضمانت کی درخواست کو منظور کیا جائے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔ "اس کے ساتھ ہی میری ایک اور استدعا ہے کہ استغاثہ کو تاکید کی جائے کہ وہ اپنے گواہوں کو جلد از جلد عدالت میں پیش کرے۔ دیٹس آل یور آنر۔"

پھر میں اپنی مخصوص سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

وکیل استغاثہ نے اٹھ کر ایک مرتبہ پھر ضمانت رکوانے کیلئے دلائل کا آغاز کیا تو اس کے پاس کہنے کیلئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ بولا۔ "یور آنر' یہ ایک قتل کا کیس ہے اور۔۔" پھر وہ پرانی تقریر دہرانے لگا۔

کچھ دیر تک جج اس کے دلائل سنتا رہا پھر پوچھا۔ "آپ کوئی نئی بات کہنا چاہتے ہیں؟"

وکیل استغاثہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جج نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے میری دائر کردہ بارود خان کی درخواست ضمانت کو پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر میرے موکل ملزم بارود خان کو تیس ہزار کے ذاتی مچلکے پر رہا کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ کو تاکید کی کہ اگلی پیشی پر تمام گواہ حاضر ہوں۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے بیس روز بعد کی تاریخ دے کر کارروائی آئندہ پیشی تک کیلئے ملتوی کر دی۔

○

استغاثہ کی طرف سے کل آٹھ گواہ پیش کئے گئے تھے۔ ان میں زیادہ تر پولیس

کے ریڈی میڈ گواہ تھے۔ میں صفحات کے کوٹے کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند اہم گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ استغاثہ کے گواہوں کی لسٹ دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا تھا۔ اس فہرست میں فائیو اسٹار کے مدیر و مالک فرید الدین۔۔۔ کا نام بھی شامل تھا۔ یہ شخص میرا خصوصی ہدف تھا۔

ایرانی ریسٹورنٹ کا مالک انور پاشا گواہی دینے کیلئے کٹہرے میں آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر بیان دیا۔ "وقوعہ کے روز میں حسب معمول کاؤنٹر پر موجود تھا۔ دوپہر ایک بجے کے قریب فائیو اسٹار۔۔ اخبار کے دفتر سے کھانے کا آرڈر دیا گیا۔ میں نے وہ آرڈر ایک پرچی پر لکھ کر کچن والوں کے حوالے کر دیا اور تاکید کر دی کہ ذرا جلدی مطلوبہ کھانے کی اشیاء تیار کر کے بھجوا دیں۔ اس کے بعد میں اپنی مصروفیات میں لگ گیا پھر جب پولیس میرے ملازم کو گرفتار کرنے ریسٹورنٹ پہنچی تو مجھے معلوم ہوا کہ فائیو اسٹار کے دفتر میں ایک لڑکی کا قتل ہو گیا تھا۔"

اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جرح کا آغاز کیا۔

"انور پاشا صاحب! ملزم بارود خان' آپ کے پاس کتنے عرصے سے ملازم تھا؟"

"کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "یہی کوئی دو ڈھائی ماہ ہوئے تھے۔"

وکیل سرکار نے پوچھا۔ "کیا آپ کو معلوم تھا کہ ملزم کو اخبار کے دفتر سے کیوں نکالا گیا تھا؟"

"جی نہیں۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ پہلے کہاں کام کرتا تھا؟"

"یعنی آپ اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے؟" وکیل سرکار نے کہا پھر پوچھا۔ "کیا آپ چھان بین کئے بغیر ملازم بھرتی کر لیتے ہیں؟"

انور پاشا نے بتایا۔ "اس کام کے لئے چھان بین کی کچھ خاص ضرورت پیش نہیں آتی۔ ویسے بھی ہم ملازم کو روزانہ اجرت دیتے ہیں۔"

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "باہر کے آرڈر لے جانے کے لئے آپ کا کوئی ویٹر مخصوص ہے یا آپ کسی کو بھی بھیج دیتے ہیں؟"

"ویسے تو باہر کھانا لے جانے کیلئے ہمارا ویٹر جمیل ہی مخصوص ہے۔ وہ خاصا پرانا

اور تجربے کار ویٹر ہے اور تمام دفتروں اور دکانوں والوں سے واقف بھی ہے۔" انور پاشا نے جواب دیا۔ "لیکن کسی ہنگامی حالت میں کسی دوسرے ویٹر کو بھی بھیج دیا جاتا ہے۔"

"ذرا سوچ کر بتائیں پاشا صاحب!" وکیل استغاثہ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "وقوعہ کے روز ایسی کیا ہنگامی صورتحال پیش آئی تھی کہ جمیل کے بجائے ملزم کھانا لے کر فائیو اسٹار کے دفتر پہنچ گیا؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے' اس روز کوئی ایمرجنسی نہیں تھی۔" انور پاشا نے جواب دیا۔ "بلکہ میرا تو خیال تھا کہ اس آرڈر کی تعمیل جمیل ہی نے کی ہو گی۔ یہ تو بعد میں جب پولیس نے ریسٹورنٹ پر چھاپا مارا تو مجھے پتہ چلا کہ جمیل کے بجائے بارود خان کھانا لے کر فائیو اسٹار کے دفتر گیا تھا۔"

وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھا پھر جج کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!"

میں وکیل مخالف کا طریقہ کار بہ الفاظ دیگر طریقہ واردات اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وقوعہ کے روز ملزم خاص طور پر فائیو اسٹار کے دفتر گیا تھا کیونکہ وہ مقتولہ فلوری کو موت کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور انور پاشا والے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے میں خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے کام کی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی اس لئے میں نے اس سے فقط ایک سوال پوچھا۔ وہ بھی غیر متوقع اور قطعی غیر متعلق سوال۔ میں نے ایرانی ریسٹورنٹ کے مالک انور پاشا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"پاشا صاحب آپ کے ریسٹورنٹ کی خاص ڈشیں کون کونسی ہیں؟"

اس نے پہلے تو حیرت سے مجھے دیکھا پھر چند ایک ڈشوں کے نام گنوا دیئے۔

"تھینک یو۔" میں نے ہونٹوں کو دبا کر مسکرانے کی کوشش کی۔ "کبھی موقع ملا تو میں آپ کے ریسٹورنٹ میں ضرور کچھ کھانے آؤں گا۔"

اس کے بعد میں نے جج کی طرف چہرہ پھیر کر کہا۔ "مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا یور

آنر۔"

اگلا گواہ ایرانی ریسٹورنٹ کا مخصوص "باہر والا ویٹر" جمیل نامی شخص تھا۔ اس نے حلف اٹھایا کہ وہ جو کچھ بھی کہے گا' سچ کہے گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہے گا پھر اس نے کم و بیش وہی بیان دیا جو اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل سرکار نے اس سے چند سرسری نوعیت کے سوالات کئے۔ زور سارا اسی بات پر تھا کہ ملزم نے خاص طور پر اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ اسٹار پلازا کا آرڈر وہ خود ہی لے کر جائے گا۔ اس سے وکیل استغاثہ کا صرف ایک ہی مقصد تھا۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ملزم ایک عرصے سے موقع کی تاک میں تھا اور موقع ملتے ہی اس نے فلوری کو قتل کر ڈالا۔

وکیل استغاثہ کے بعد میں جرح کیلئے کٹہرے کے پاس آیا۔ "جمیل صاحب! آپ کے ریسٹورنٹ کے مالک کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک طویل عرصے سے اس کے یہاں ملازم ہیں۔ آپ اس طویل کی وضاحت کریں گے؟"

"میں تقریباً آٹھ سال سے یہاں کام کر رہا ہوں۔"

"پھر تو آپ خاصے تجربے کار ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اپنے ہم پیشہ بھائیوں کو بھی خوب پہچانتے ہوں گے؟"

وہ انکسار سے بولا۔ "بس جی اللہ کی مہربانی ہے۔ ایک بار جس سے مل لیتا ہوں' اس کے رنگ ڈھنگ کو اچھی طرح جان جاتا ہوں۔"

"ویری گڈ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ذرا یہ تو بتائیں کہ ملزم بارود خان کیسا لڑکا ہے؟"

"مجھے تو ٹھیک ٹھاک ہی لگا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کبھی محسوس کیا کہ وہ خفیہ طور پر کوئی قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا؟"

"وہ ایسا تو نہیں تھا لیکن پتہ نہیں کس جذبے کے تحت اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کو یقین ہے کہ اس نے یہ قدم اٹھایا ہو گا؟"

"یقین تو نہیں آتا پر سب کچھ سامنے ہے۔"

میں نے جرح ختم کر دی۔ جمل کے بعد فائیو اسٹار کے اسٹاف میں سے تین افراد گواہی کیلئے آئے۔ نیوز ایڈیٹریاور عباسی' فوٹوگرافر ناصر بخاری اور اکاؤنٹنٹ محمد عارف نے کم و بیش ایک جیسا بیان دیا۔ وقوعہ کے وقت ان تینوں میں سے کوئی بھی دفتر میں موجود نہیں تھا تاہم ان کا بیان میرے موکل کے خلاف جاتا تھا۔ ان کے ملے جلے بیان کا خلاصہ میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ان سب نے باری باری حلف اٹھانے کے بعد بیان دیا تھا کہ ملزم ان کے باس کی سیکرٹری مقتولہ فلوری پر لٹو ہو گیا تھا۔ وہ محض فلوری کی خاطر سامنے کے دفتر سے ملازمت چھوڑ کر کم تنخواہ پر اخبار کے دفتر میں آگیا تھا۔ پھر جب فرید الدین کو اس کی حرکتوں کا علم ہوا تو اس نے خوب ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس کے بعد سے ملزم فرید الدین کے خلاف سب کے سامنے زہر اگلتا رہتا تھا۔ فوٹوگرافر ناصر بخاری نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس نے ملزم کے پاس ایک پسٹل بھی دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ سب کو ایک مشترک شکایت یہ تھی کہ ملزم نظر بچا کر چھوٹی موٹی چیزیں پار کر لیا کرتا تھا اور اگر وہ اس سے سگریٹ پان وغیرہ منگواتے تھے تو وہ اس میں سے بھی پیسے مار لیتا تھا۔

ملتی جلتی جرح کا احوال بیان کر کے میں صفحات کو ضائع نہیں کرنا چاہتا اس کے ساتھ ساتھ مجھے قارئین کی طبع نازک کا بھی خیال ہے اس لئے میں غیردلچسپ اور بور عدالتی کارروائی کو حذف کر کے صرف فوٹوگرافر ناصر بخاری سے کئے گئے سوال جواب تحریر کر رہا ہوں۔ ناصر بخاری اس لئے بھی اہم گواہ تھا کہ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس نے ملزم یعنی میرے موکل بارود خان کے پاس کسی پسٹل کی جھلک دیکھی تھی۔ اس سلسلے میں بارود خان مجھے پہلے ہی بریف کر چکا تھا۔

میں نے گواہوں کے کٹہرے کے پاس جا کر ناصر بخاری سے پوچھا۔ "بخاری صاحب! آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ آپ نے ملزم کے پاس کوئی پسٹل وغیرہ بھی دیکھا تھا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "جی ہاں' وہ ایک پسٹل ہی تھا جو چھٹی کے وقت ملزم اپنے نیفے میں اڑس رہا تھا۔"

"بخاری صاحب آپ نے وہ پسٹل اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا تھا؟"

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "مجھے کیا ضرورت تھی اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کی بلکہ میں نے تو اسے بھی منع کیا تھا کہ ایسی چیزوں سے دور رہا کرے ورنہ کبھی نقصان اٹھا بیٹھے گا لیکن اس نے میرا مذاق اڑایا تھا اور مجھے بزدل ہونے کا طعنہ بھی دیا تھا۔۔ یہی نہیں' بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہتھیار مرد کا زیور ہوتا ہے۔ اس نے وہ پسٹل درے سے منگوایا تھا۔ اگر فرید الدین نے اس کی محبوبہ چھیننے کی کوشش کی تو وہ اسے شوٹ بھی کر سکتا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے فوری طور پر کہا۔ "ہیٹو از پوائنٹ یور آنر! گواہ کے اس جملے کو ریکارڈ پر لایا جائے۔ ملزم نے ایک معزز شخص کے سامنے فرید الدین کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "دھمکی روبرو دی جاتی ہے۔ میرے موکل نے تھرڈ پرسن کے سامنے اپنے عزائم کا اظہار کیا تھا۔"

"ایک ہی بات ہے۔" وکیل استغاثہ نے جھنجلا کر کہا۔ "ملزم نے دھمکی دی تھی یا اپنے عزائم کا اظہار کیا تھا۔ بہرحال ایک بات ثابت ہو گئی کہ وہ اپنے ولی نعمت کیلئے کس قسم کے جذبات رکھتا تھا۔ ملزم ایک کینہ پرور انسان ہے اور اس کی کینہ پروری کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔"

میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ہیٹو از آلسو این امپارٹنٹ پوائنٹ یور آنر! بقول میرے فاضل دوست' میرا موکل ایک کینہ پرور انسان ہے۔ اس نے اپنے رقیب روسیاہ کو قتل کرنے کے عزائم کا اظہار کیا اور پھر۔۔ ایز اسٹیٹ مائی ڈیئر کونسل میرے موکل نے اپنی کینہ پروری میں جو قدم اٹھایا' اُس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ یعنی اس نے اپنی محبوبہ جاں فزا کے خون میں ہاتھ رنگ ڈالے حالانکہ وکیل سرکار کے عطا کردہ خطاب "کینہ پرور" کے مطابق تو میرے موکل کو چاہئے تھا کہ وہ اپنے رقیب کی زندگی کا چراغ گل کرتا۔"

جج دلچسپی سے میرے دلائل سن رہا تھا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یور آنر' گواہ استغاثہ ناصر بخاری نے جس پسٹل کا ذکر کیا ہے' میں ابھی

اس کی حقیقت معزز عدالت کے سامنے پیش کرتا ہوں۔"

حاضرین عدالت۔۔ میرے اگلے اقدام کا انتظار کرنے لگے۔ وہاں موجود تمام افراد سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ میں نے اپنے موکل کے والد بندوق خان سے کہا کہ وہ لفافہ میرے حوالے کر دے جو میں نے اسے آج اپنے ساتھ لانے کو کہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ ناصر بخاری پر جرح کے دوران میں مجھے اس لفافے کی ضرورت پڑے گی کیونکہ ناصر نے پولیس کو جو بیان دیا تھا اس میں پسٹل کا ذکر موجود تھا اور میں نے پولیس ایف آئی آر' استغاثہ کے گواہان کے بیانات اور پولیس کے پیش کردہ چالان کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔

میں مذکورہ لفافہ ہاتھ میں تھامے ہوئے ناصر بخاری کے پاس آ گیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "بخاری صاحب' جو پسٹل آپ نے ملزم بارود خان کو اپنی شلوار کے نیفے میں اڑستے ہوئے دیکھا تھا' اسے دوبارہ دیکھنے پر آپ پہچان سکتے ہیں؟"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ "معزز گواہ نے اپنے بیان میں بتایا کہ اس نے ملزم کے پاس پسٹل کی ایک جھلک دیکھی تھی' اسے ہاتھ میں لے کر چھو کر دیکھا تھا نہ اس کا تفصیلی معائنہ ہی کیا تھا۔ پھر گواہ اسے دوبارہ دیکھ کر کیسے پہچان سکتا ہے؟"

میں نے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ "میرے فاضل دوست' آپ نے خواہ مخواہ اپنی توانائی ضائع کر دی۔" وہ سوالیہ نظروں سے مگر گھورتے ہوئے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میرے اس سوال کا جواب گواہ ناصر بخاری چند الفاظ میں دے سکتا تھا۔۔۔ نہیں جناب' میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

وکیل استغاثہ نے اپنی خفت مٹانے کیلئے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی' وکیل صفائی خواہ مخواہ معزز عدالت کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ یہ اس قسم کے ڈراموں کیلئے خاصے مشہور ہیں۔ میں ان کی شعبدہ بازیوں سے بخوبی واقف ہوں۔"

میں نے کہا۔ "یور آنر' اگر شعبدہ بازیوں یا ڈرامے ناٹک سے حقائق کا چہرہ

واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہو اور الجھی ہوئی عدالتی سچویشن سلجھتی ہوئی نظر آنے لگے' زیر سماعت مقدمے پر بھرپور روشنی پڑے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ لیکن اگر میرے فاضل دوست کی طرح معزز عدالت کو بھی میرے انداز جرح پر اعتراض ہے تو میں انتہائی معذرت خواہ ہوں۔" اتنا کہہ کر میں واپس اپنی مخصوص سیٹ کی طرف جانے لگا۔

مجھے اپنی پشت پر جج کی آواز سنائی دی۔ "بیگ صاحب' اس لفافے میں کیا ہے؟"

میں نے سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے مڑ کر دیکھا' جج دلچسپی سے میری جانب متوجہ تھا۔ میں چلتے ہوئے اس کی میز کے پاس آیا پھر میز کے اوپر سے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ جج کی جانب بڑھا دیا۔ اس کے بعد کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یور آنر' اس لفافے میں وہ کھلونا پستول ہے جو گرفتار ہونے سے چند روز پہلے تک میرا موکل اپنی شلوار کے نیفے میں اڑسے پھرتا تھا۔ یہ چائنا میڈ پلاسٹک کا پسٹل ہے جو دیکھنے میں ہوبہو اصلی نظر آتا ہے۔ آج کل دنیا میں نقل اتنی شان دار اور مکمل بننے لگی ہے کہ دیکھ کر اصل شرما جائے۔ یہی پستول گواہ ناصر بخاری نے میرے موکل کے پاس دیکھا تھا اور غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔"

"وہ غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ ملزم نے خود اسے بتایا تھا کہ وہ اس پستول سے فرید الدین کا مرڈر کرے گا۔" وکیل استغاثہ نے دلیل پیش کی۔ "اتنے چھوٹے بچے کو اپنے پاس ایسی خطرناک چیزیں رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ضرورت ہے' بڑی اشد ضرورت ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس ضرورت کی وضاحت کرنے سے پہلے میں کچھ اور کہنا چاہوں گا۔"

"جی ارشاد۔" وکیل استغاثہ نے طنز کا تیر چھوڑتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا موکل پورے بیس سال کا ہے۔ آئی مین' ہی از ٹوئنٹی ایرز اولڈ۔ ڈو یو انڈر اسٹینڈ وہاٹ آئی مین ٹو سے؟ اس لئے میرے موکل کو "اتنا چھوٹا بچہ" کہنا انتہائی نامناسب اور اخلاقیات کے منافی ہے۔ دوسری بات

یہ کہ "کھلونا پستول" کا شمار خطرناک اشیاء میں نہیں ہوتا۔ آج کل ہمارے گھروں میں بچوں کے زیادہ تر کھلونے اسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً پستول' کلاشنکوف' اوزی گن' ٹینک اور خنجر وغیرہ۔ اب میں اس ضرورت کی وضاحت کرتا ہوں جس کے تحت میرے موکل نے چائنا میڈ پستول اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔" میں نے چند لمحات کا توقف کیا پھر بھاری آواز میں کہا۔ "دراصل بات اتنی سی ہے کہ میرا موکل اپنا نشانہ پکا کر رہا تھا۔ یہ اس کے کلچر کا حصہ بلکہ تقاضا ہے۔"

اس دوران میں جج اس کھلونا پستول کو الٹ پلٹ کر دیکھ چکا تھا اور پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد اس نے وہ پستول مجھے واپس کر دیا۔ میں نے وہ لفافہ بندوق خان کے حوالے کر دیا۔

جج بار بار گھڑی کو دیکھ رہا تھا' میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے چیمبر میں جانا چاہتا ہے۔ اس نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ "آپ کے گواہ بھگت گئے یا کوئی باقی ہے؟"

"سب سے اہم گواہ ابھی باقی ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے کہا۔ "فائیو اسٹار اخبار کے مالک فرید الدین--- صاحب جن کے کمرے میں وقوعہ پیش آیا تھا۔"

جج نے پوچھا۔ "وہ آج عدالت میں حاضر کیوں نہیں ہوا؟"

"ان کی طبیعت خراب ہے' انشاء اللہ آئندہ پیشی پر حاضر ہو جائیں گے۔"

جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ مزید کچھ کہنا چاہتے ہیں وکیل صاحب؟"

میں نے کہا۔ "میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا موکل بے گناہ ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ جلد از جلد رہا ہو جائے یعنی اس مقدمے سے باعزت طور پر بری ہو جائے۔"

"آپ نے صفائی کے گواہوں کو ابھی تک پیش نہیں کیا؟"

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "کچھ ٹیکنیکل وجوہات ہیں جناب عالی۔ پہلے استغاثہ کا سب سے اہم گواہ بھگت جائے کیونکہ مجھے خدشہ ہے یہ با اثر آدمی صفائی کے گواہوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔"

جج میری بات کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے وکیل استغاثہ کو ہدایت کی کہ آئندہ

تاریخ پر وہ گواہ فرید الدین کو ضرور عدالت میں پیش کرے۔ وکیل سرکار نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر جج نے اگلی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

○

آئندہ پیشی سے پہلے میں نے اول خان کو اپنے دفتر میں بلایا اور مزید کچھ کام اسے سونپ دیئے۔ شاید میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ اب تک کی عدالتی کارروائی کے دوران میں مقتولہ فلوری کی ممی جوزفین برابر حاضری دیتی رہی تھی۔ میں نے اپنی جانب سے صفائی کے گواہوں کے جو نام عدالت میں پیش کئے تھے ان میں ایک نام جوزفین کا بھی تھا لیکن اسے سختی سے تنبیہہ کر دی تھی کہ وہ اپنے طور پر کسی قسم کی ایفی شینسی نہ دکھائے۔ وہ میری ہم خیال بھی تھی اور اسے میرے نقطہ نظر سے اتفاق بھی تھا۔

میں نے اگلی پیشی سے پہلے خود بھی اپنے گواہوں کے ساتھ دو تین ملاقاتیں کیں اور انہیں اچھی طرح بریف کر دیا کہ انہیں کب اور کس موقع پر کیا کہنا ہے۔

آئندہ پیشی پر کوئی قابل ذکر کارروائی نہ ہو سکی۔ ہمارے کیس کی باری بالکل آخر میں آئی تھی۔ اس کے بعد کی دو پیشیاں بھی خالی چلی گئیں۔ ایک مرتبہ وکیل استغاثہ غیر حاضر تھا اور دوسری بار فرید الدین بوجوہ عدالت نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس طرح ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ پھر جب ہماری تاریخ آئی تو میں نے پیش کار کی مٹھی گرم کر کے اپنے کیس کا پہلا نمبر لگوا لیا۔ اس طرح ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت حاصل ہو گیا تھا۔

جج اپنی کرسی پر براجمان ہو چکا تو عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج کی اجازت سے وکیل استغاثہ نے اپنے اہم ترین گواہ فرید الدین-- کو کٹہرے میں بلایا۔ فرید الدین ایک لحیم شحیم اور مضبوط کاٹھی کا مالک شخص تھا۔ اس کے لمبے بال کسی حسینہ کی زلفوں کے مانند کندھوں کو چھو رہے تھے۔ اس کی کنگ سائز توند شرٹ پھاڑ کر باہر نکلنے کو بے قرار نظر آتی تھی۔ عدسوں والے چشمے کے پیچھے اس کی آنکھیں لومڑی کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

فرید الدین نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد بیان دیا۔ "جناب عالی! وقوعہ کے روز ہمارے اخبار کی کاپی تقریباً گیارہ بجے پریس چلی گئی تھی حالانکہ عموماً" اس سے پہلے جاتی تھی۔ اس دن کسی خاص وجہ سے کاپی لیٹ کی گئی تھی' میرا مطلب ہے کسی امپارٹنٹ ایونٹ کا انتظار تھا۔ خیر بارہ ساڑھے بارہ تک عملے کے بیشتر افراد دفتر سے جا چکے تھے۔ ایک بجے تک میں اور فلوری دفتر میں رہ گئے۔ مجھے کچھ ضروری کام نمٹانا تھے اس لئے فلوری کا رکنا بھی ضروری تھا۔ فلوری نے مجھ سے کہا کہ کام تو ہوتا ہی رہے گا' پہلے کچھ پیٹ پوجا کر لی جائے۔ میں نے کہا' وقت تو کھانے کا ہو رہا ہے اس لئے لائٹ ریفریشمنٹ کے بجائے کھانا ہی کھایا جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے ایک نزدیکی ایرانی ریسٹورنٹ میں فون کر کے کھانے کا آرڈر دے دیا پھر ہم باتوں میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں ہاتھ منہ دھونے واش روم میں چلا گیا۔ میں پوری طرح منہ پر صابن لگا چکا تھا کہ میں نے کمرے کے اندر فائرنگ کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی فلوری کی ایک گھٹی گھٹی چیخ بھی میرے کانوں تک پہنچی۔ میں نے دو چھپاکے مار کر منہ کا صابن صاف کیا اور اٹیچڈ باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ اس وقت تک معاملہ ہی الٹ چکا تھا۔ فلوری خون میں لت پت تھی' میز پر کھانے کی ٹرے رکھی تھی اور میری ویسٹ اینڈ واچ گھڑی میز پر غائب تھی۔ میں نے فوراً فون کر کے پولیس کو بلا لیا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔"

فرید الدین کا بیان پولیس رپورٹ سے لگاؤ کھاتا تھا۔ لگتا تھا دونوں ایک دوسرے کی کاربن کاپی ہیں۔ فرید الدین بیان دے چکا تو وکیل سرکار نے سرسری سے ایک دو سوال کئے۔ پھر میری باری آئی۔ میں اٹھ کر اس کے کٹہرے کے پاس آیا پھر سلسلہ سوالات کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"فرید الدین صاحب! آپ نے ابھی معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز دوپہر ایک بجے تک دفتر کے اسٹاف کے تمام لوگ جا چکے تھے سوائے آپ کے اور آپ کی سیکریٹری مقتولہ فلوری کے۔ ذرا سوچ کر بتائیں' کیا واقعی آپ دونوں کے سوا دفتر میں اور کوئی بھی نہیں تھا؟"

اس نے سوچنے کی زحمت کئے بغیر پٹ سے جواب دیا۔ "ہاں' بس ہم دونوں ہی

تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "اسٹاف کا آخری ممبر کتنے بجے دفتر سے نکلا تھا اور وہ کون تھا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ "سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔ میرے آئندہ بہت سے سوالات آپ کے جواب سے متعلق ہو سکتے ہیں۔"

فرید الدین نے بتایا۔ "سب سے آخر میں نصیبت خان رخصت ہوا تھا۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی پھر اگلا سوال کیا۔ "فرید الدین صاحب' نصیبت خان کو آپ نے کتنے بجے رخصت ہونے کی اجازت دی تھی؟"

"کوئی لگ بھگ ایک بجے۔"

میں نے پوچھا۔ "نصیبت خان آپ کے دفتر میں کس قسم کی خدمات انجام دیتا ہے؟"

"وہ آؤٹ ڈور کلرک ہے مگر ضرورت پڑنے پر دفتر کے مختلف کام بھی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ ایک پیون سے لے کر ڈسک کے کاموں تک سب کچھ کر سکتا ہے۔"

"فرید الدین صاحب۔" میں نے جرح کے سلسلہ کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ "وقوعہ کے روز جب کہ آپ کو کچھ ضروری کاموں کے لئے دیر تک دفتر میں بیٹھنا تھا' آپ نے دفتر کے تمام اسٹاف کو جانے دیا جب کہ آپ کو کم از کم ایک پیون کو تو روک لینا چاہئے تھا یا۔۔۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل سرکار نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ "وکیل صفائی نے عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کا آغاز کر دیا ہے۔ ایسے فضول اور بے معنی سوال کی آخر کیا تک ہے۔ معزز گواہ کسی چپراسی کو روکتے یا نہ روکتے۔ اس سے میرے فاضل دوست کو کیا تکلیف ہے۔"

میں نے کہا۔ "یور آنر! اگر گواہ کو جواب دینے میں کوئی اعتراض ہے تو میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" فرید الدین نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ "میں آپ

کے سوال کا جواب ضرور دوں گا اور وہ جواب یہ ہے کہ میں نے پہلے نصیبت خان کو روکنے کا ارادہ کیا تھا مگر آپ کی اطلاع کیلئے عرض کرتا چلوں کہ اس دن جمعہ تھا اور نصیبت خان پابندی سے نماز ادا کرنے کا عادی ہے اس لئے میں نے اسے بھی جانے دیا تھا۔

"آپ کے خیال میں نصیبت خان کیسا آدمی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اس سے کوئی خاص شکایت نہیں ہے۔"

"فرید الدین صاحب! کیا آپ اکثر مذکورہ ایرانی ریسٹورنٹ سے لنچ منگوایا کرتے تھے؟"

اس نے جواب دیا۔ "اکثر نہیں، کبھی کبھار۔ ورنہ عام طور پر میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاتا ہوں۔ اس روز چونکہ فلوری بھی موجود تھی اور میں جانتا تھا کہ فلوری بھوک کی بہت کمزور ہے اس لئے میں نے باقاعدہ کھانے کا آرڈر دے دیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "فرید الدین صاحب! ذرا سوچ کر بتائیں، وقوعہ کے روز سے پہلے آپ نے آخری مرتبہ ایرانی ریسٹورنٹ سے کب کوئی کھانے پینے کی چیز منگوائی تھی؟"

"بالکل ٹھیک بتانا تو ممکن نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ ڈھائی تین ماہ بعد میں نے اس ریسٹورنٹ سے کچھ منگوایا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نہیں جانتے تھے، ملزم اس ریسٹورنٹ میں بیرا گیری کرتا تھا؟"

"میں واقعی نہیں جانتا تھا۔"

میں نے فرید الدین سے پوچھا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے، ملزم نے آپ کے دفتر سے ملازمت چھوڑنے کے بعد کہاں ملازمت کی تھی؟"

"ملزم نے ملازمت چھوڑی نہیں تھی بلکہ میں نے اسے ملازمت سے نکال دیا تھا۔" وہ ناگواری سے بولا۔ "اس کے بعد وہ کہاں کہاں گھومتا پھرا ہو گا، ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی معلومات رکھنا وقت کے زیاں کے مترادف ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ وقت واقعی بہت قیمتی شے ہے۔ اسے حتی الوسع ضائع

ہونے سے بچانا چاہئے۔"

اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے پوچھا۔ "فرید الدین صاحب، کیا آپ اکثر اپنی سیکرٹری مقتولہ فلوری کے ساتھ دیر تک دفتر میں رکتے تھے؟"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے میری جرح کے سلسلے کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔ "وکیل صفائی غیر ضروری سوالات کر کے معزز گواہ کی ذاتیات کو بیچ میں لا رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکت سے باز رکھا جائے۔"

میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "یہ غیر ضروری سوال ہرگز نہیں ہے۔" پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ "یور آنر، قتل کی یہ واردات جس میں میرے موکل کو ایک سازش کے تحت پھانسا گیا ہے، کٹہرے میں کھڑے ہوئے فرید الدین کے کمرے میں واقع ہوئی ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ ایک کمرے میں بند دو افراد کی ذاتیات بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو جاتی ہیں اس لئے اگر ہم مقتولہ کا ذکر کریں گے تو لامحالہ فرید الدین بھی زیر بحث آئیں گے --- اور --- اس صورت میں تو خاص طور پر کہ مقتولہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اسے دو ماہ کی حاملہ بھی ظاہر کرتی ہے، جبکہ وہ اپنی پوری زندگی میں ایک غیر شادی شدہ لڑکی تھی۔"

وکیل استغاثہ اچھل پڑا۔ "جناب عالی، میں نے عرض کیا تھا نا، وکیل صفائی اسی قسم کی بے سروپا باتیں کرتے ہیں۔ اب انہوں نے معزز گواہ پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے۔"

"میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔" میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

جج نے وکیل سرکار کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے جرح جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ میں اس کیس کے جس پہلو کی جانب جج کی توجہ مرکوز کروانا چاہتا تھا، جج اس طرف متوجہ ہو چکا تھا اور دھیرے دھیرے سر کو اثباتی جنبش بھی دے رہا تھا۔

میں نے جرح جاری رکھتے ہوئے سوال کیا۔ "فرید الدین صاحب، آپ نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ فائرنگ کی آواز سن کر واش روم سے

باہر آئے تھے اور فلوری کو خون میں لت پت دیکھ کر آپ نے فوراً پولیس کو فون کر دیا تھا؟"

وہ خاصا نروس دکھائی دے رہا تھا' بولا۔ "آپ کو میرے اس بیان پر کوئی اعتراض ہے؟"

"ناٹ ایٹ آل۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو بس ایک بات کی آپ سے تصدیق چاہی تھی۔"

"اگر آپ کی تسلی ہو گئی ہو تو جرح کو آگے بڑھائیں۔" وکیل صفائی نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔

میں نے اس کے نظر کو نظرانداز کرتے ہوئے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے فرید الدین سے پوچھا۔ "ذرا سوچ کر بتائیں' آپ کے فون کے کتنی دیر بعد پولیس موقع واردات پر پہنچی تھی؟"

"کوئی پندرہ بیس منٹ تو لگے ہی ہوں گے۔" وہ پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا۔

"اس دوران میں آپ کیا کرتے رہے؟"

"ظاہر ہے' گواہ پولیس کا انتظار کرتا رہا ہو گا۔" وکیل سرکار نے بیچ میں ٹانگ اڑائی۔

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی' میری لرنڈ کورٹ سے التماس ہے کہ وکیل استغاثہ کو جرح میں مداخلت سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔ گواہ قوت گویائی سے محروم نہیں ہے جو میرے فاضل دوست کو اس کے خیالات کی ترجمانی کرنا پڑ رہی ہے۔"

جج نے میرے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے وکیل استغاثہ کو تنبیہہ کر دی۔ میں نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے فرید الدین جو اب خاصا پریشان نظر آ رہا تھا' اس سے اپنا سابق سوال دہرا دیا۔

فرید الدین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہ کیا جواب دے۔ آخر کار اس نے اپنے وکیل کی بات دہرا دی۔ "میں پولیس کا انتظار کرتا رہا تھا۔"

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "حالانکہ اس وقت آپ کا فرض بنتا تھا

کہ فوری طور پر مقتولہ کو کسی ہسپتال میں پہنچاتے یا ایک انسان ہونے کے ناتے کم از کم کسی ہسپتال میں فون کر کے کوئی ایمبولینس وغیرہ ہی منگوا لیتے۔ اتنا کچھ تو ایک انجان آدمی کیلئے بھی کیا جا سکتا ہے جبکہ مقتولہ تو آپ کی پرسنل سیکرٹری تھی جس کی تواضع کیلئے آپ ایک شاندار لنچ کا آرڈر دے چکے تھے۔" میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر فرید الدین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ نے مقتولہ کو تڑپ تڑپ کر مرنے کیلئے چھوڑ دیا اور پولیس کا انتظار کرتے رہے۔"

"وہ تو ذرا بھی نہیں تڑپی تھی۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ بات کو سنبھالتے ہوئے لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ "میرا مطلب ہے' جب میں باتھ روم سے باہر آیا تو وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس کی لاش بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔" اپنی بات ختم کرتے ہی وہ پریشان نظروں سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔

وکیل استغاثہ نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے کہا۔ "جناب عالی' جس انسان کے سینے میں بتیس بور کی دو گولیاں اتر چکی ہوں وہ پلک جھپکتے میں ٹھنڈا ٹھار تو نہیں ہو سکتا۔ گواہ کا بیان مبنی بر دروغ ہے۔ ایسے جواب کی کسی بچے سے بھی امید نہیں کی جا سکتی۔"

وکیل استغاثہ نے گواہ فرید الدین کی حمایت میں ایک نکتہ اٹھایا۔ "جناب عالی' گواہ اپنے کمرے میں فائرنگ کی آواز سن کر اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ اس جانب اس کی توجہ ہی نہیں گئی ہو گی۔ پریشانی کے عالم میں انسان سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔"

"اچھی منطق ہے۔" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وکیل استغاثہ کی ایکس پلی نیشن کو ریکارڈ پر لایا جائے جناب عالی۔" اس کے بعد کٹہرے میں کھڑے فرید الدین سے سوال کیا۔ "فرید الدین صاحب! پولیس کی آمد پر آپ نے پولیس کو بیان دیا کہ ملزم بارود خان نے آپ کی سیکرٹری کو قتل کر دیا ہے۔ آپ نے پولیس کو قتل کی وجہ انتقامی کارروائی بتائی تھی۔ بعد ازاں پولیس نے ملزم کو ریسٹورنٹ سے گرفتار کر لیا تھا۔ آپ اس معزز عدالت کو بتائیں گے کہ آپ کو یہ بات کیسے معلوم

ہوئی کہ مقتولہ فلوری کو ملزم بارود خان ہی نے قتل کیا تھا جبکہ تھوڑی دیر پہلے آپ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اقرار کر چکے ہیں کہ آپ نہیں جانتے تھے' ملزم مذکورہ ایرانی ریسٹورنٹ میں بیرا گیری کر رہا تھا؟"

اچانک اس کے چہرے پر مجھے زردی کھنڈتی ہوئی نظر آئی لیکن فوراً ہی اس نے سنبھالا لے لیا۔ اپنے لہجے میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "میں واقعی نہیں جانتا تھا کہ قتل بارود خان نے کیا تھا۔ میں نے پولیس کو بتایا تھا کہ ایرانی ریسٹورنٹ سے آنے والے بیرے نے قتل کر دیا ہے۔ کیونکہ جب میں باتھ روم سے باہر آیا تو میز پر کھانے کی ٹرے موجود تھی اور میری گھڑی ناموجود۔"

"لیکن آپ کا دستخط شدہ بیان جو آپ نے وقوعہ کے روز پولیس کو دیا تھا اس میں تو یہی درج ہے کہ آپ نے پولیس کو بتایا تھا' بارود خان نے آپ کی سیکریٹری کو قتل کر دیا ہے۔ آپ کے کون سے بیان کو درست مانا جائے؟"

"پولیس نے اپنے طور پر غلط لکھ دیا ہو گا۔ درست وہی ہے جو میں نے ابھی بتایا ہے۔"

"کیا آپ نے دستخط کرنے سے پہلے پولیس کا تحریر کردہ بیان پڑھا نہیں تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "پڑھا تو تھا لیکن اس طرف میرا دھیان نہیں گیا۔ دراصل میں اس وقت حواس باختہ ہو رہا تھا۔"

میں نے اگلا سوال کیا۔ "فرید الدین صاحب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ بات بھی درج ہے کہ مقتولہ کے سر پر کسی شدید چوٹ کے اثرات پائے گئے تھے۔ آپ اس چوٹ کے بارے میں معزز عدالت کو کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟"

"چوٹ!" اس نے ہراساں نظروں سے مجھے دیکھا۔ "میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" پھر وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگا۔

"فرید الدین صاحب!" میں نے اپنی جرح کے زاویئے کو تبدیل اور سوالات کو کاٹ دار بناتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے مقتولہ فلوری سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا؟"

اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے' گھگیا کر بولا۔ "یہ جھوٹ ہے'

سراسر مجھ پر الزام ہے۔" اس کی آواز میں لرزش کی آمیزش تھی۔ "میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش ہوں۔"

میں نے اس کی جذبات انگیزی سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ "آپ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش رہنے پر مجبور ہیں کیونکہ آج آپ جو کچھ بھی ہیں وہ اپنی بیوی کی وجہ سے ہی ہیں۔ ماضی بعید میں آپ اپنے سسر کے معمولی سے ملازم ہوا کرتے تھے۔ اسی اخبار کے دفتر میں۔ مرحوم نے مرنے سے پہلے ایک اچھا کام یہ کیا کہ سب کچھ اپنی بیٹی کے نام کر گیا۔ یہ اخبار' دولت' جائیداد' گھربار اور گاڑی سب آپ کی بیوی کی ملکیت ہے۔ عملی طور پر آپ ہر شے کے مالک ہیں مگر قانوناً آپ کسی چیز پر اپنا حق نہیں جتا سکتے۔ آپ کی قسمت بری کہ آپ کی زوجہ محترمہ اتفاق سے اللہ میاں کی گائے نہیں ہیں' ورنہ تو آپ جانے کیا کچھ کر ڈالتے۔ آپ کی بیوی نے آپ کے ہر معاملے پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے اور آپ کو بے دست و پا کر دیا ہے۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔" وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "اب اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی کہ میرے فاضل دوست وقت ضائع کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اب اسی بات کو لے لیں۔ ابھی جو انہوں نے طولانی تقریر فرمائی ہے' اس کا موجودہ کیس سے کیا تعلق ہے؟"

جج نے مجھے غیر ضروری باتوں سے پرہیز کی تلقین کرتے ہوئے جرح جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ میں نے بڑے احترام سے کہا۔ "جناب عالی' میں اس بات کو ثابت کر سکتا ہوں کہ گواہ فرید الدین نے مقتولہ فلوری سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا اور ان کے درمیان ایک باس اور سیکریٹری سے کہیں آگے بڑھ کر تعلقات پائے جاتے تھے۔"

"آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے؟" فرید الدین نے برہمی سے پوچھا۔

میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ "ایک ثبوت تو آپ کی یہ برہمی ہی ہے۔ اور دوسرا جیتا جاگتا ثبوت عدالت کے اس کمرے میں موجود ہے۔"

"پھر ڈرامہ شروع۔" وکیل سرکار نے زیر لب کہا۔

جج تک یا تو اس کی آواز پہنچی ہی نہیں تھی یا پھر اس نے وکیل استغاثہ کے

تبصرے کو دانستہ نظر انداز کر دیا تھا۔ جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کس جیتے جاگتے ثبوت کی بات کر رہے ہیں؟“

”مقتولہ فلوری کی ممی جوزفین یور آنر!“ میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ”جوزفین عدالت کے کمرے میں موجود ہیں اور میرے دعوے کی تصدیق کر سکتی ہیں۔“

پھر جج کی اجازت سے جوزفین نے گواہوں کے کٹہرے میں آ کر حلف اٹھایا اور سچ بولنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد میری بات کی تصدیق کر دی کہ گواہ فرید الدین فلوری سے شادی میں انٹرسٹڈ تھا اور یہ بات فلوری نے خود اپنی ممی کو بتائی تھی۔

فرید الدین دوبارہ کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا تو میں نے سوال کیا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کے روز آپ کی اور مقتولہ فلوری کی کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں اس کے سر میں ایک گہری چوٹ آئی تھی اور وہ---“ میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ میرے اس اچانک سوال پر بوکھلا گیا۔ میں تو اول خان کی محنت اور نصیبت خان کے مخلصانہ تعاون کے بل بوتے پر اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ رفتہ رفتہ میری پکڑ میں آتا جا رہا تھا۔ اس نے پہلے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر جواب دیا۔ ”ہمارے درمیان کسی قسم کی تلخ کلامی نہیں ہوئی تھی۔“

وکیل استغاثہ نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یور آنر! کیا میرے فاضل دوست کے پاس اس فرضی تلخ کلامی کا کوئی ثبوت موجود ہے؟“

”ثبوت موجود ہے اور مناسب وقت پر پیش کیا جائے گا۔“ میں نے براہ راست وکیل استغاثہ کو جواب دیا۔

جج میری جرح کے انداز کو سمجھ رہا تھا اور اس نے میرا ارادہ بھی بھانپ لیا تھا۔ اس کی دلچسپی سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ میری کارکردگی خاصی اطمینان بخش تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! استغاثہ کے سب سے اہم گواہ کی گواہی مشکوک ہو چکی ہے۔ اس نے پولیس کو کچھ اور معزز عدالت کو کچھ اور بیان دیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ بعض معاملات میں میرے سوالوں کے نامکمل اور غیر واضح جواب دیئے ہیں۔ علاوہ ازیں فلوری کے قتل کے بعد مقتولہ کے ساتھ

اس کا غیر انسانی رویہ بھی بہت کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ پھر مقتولہ کی ممی اس بات کی تصدیق کر چکی ہے کہ موصوف مقتولہ کو شادی کے سبز باغ دکھا رہا تھا حالانکہ گواہ اس بات سے انکاری ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسی باتیں ہیں جو گواہ کی شخصیت کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرتی ہیں اس لئے میری معزز عدالت سے التجا ہے کہ فرید الدین کو پابند گواہ کی حیثیت سے شامل تفتیش کیا جائے۔ پولیس کی ناقص اور نامکمل تفتیش پر گواہ فرید الدین کے اثرات کی چھاپ نظر آتی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے فرید الدین کو پابند گواہ قرار دیتے ہوئے ہر پیشی پر باقاعدگی سے حاضر ہونے کی تاکید کی اور آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو تفتیشی افسر رانا شوکت نے پوچھا۔ ”اب کون سا گل کھلانے کا ارادہ ہے وکیل صاحب؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے۔“

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ پر رشوت کا مقدمہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”پولیس--- اور دوسروں پر رشوت کا مقدمہ کرے گی؟“ میں نے گہری چوٹ کی۔ ”قبلہ یہ تو بتلائیں کہ میں نے کس سے رشوت لی ہے؟“

”رشوت لی نہیں بلکہ دی ہے۔“ رانا شوکت نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اور وہ بھی ہمارے تھانے کے ایس آئی کو‘ پورے سو روپے۔“

”گویا آپ عدالت کے برآمدے میں اس بات کا سرعام اقرار کر رہے ہیں کہ آپ کے تھانے کا ایس آئی رشوت کے معاملے میں وکیلوں کو بھی نہیں چھوڑتا؟“

وہ میرے اس جواب پر گڑبڑا گیا اور پریشان نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے لگا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اس کی بات نہ سن لے۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ نے واقعی مجھ پر رشوت دینے کا مقدمہ کر دیا رانا صاحب--- تو میں آپ کو اپنا وکیل مقرر کروں گا۔“

میں جانتا تھا کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچ رہی تھی اس لئے میں تفتیشی افسر کو اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

میرا موکل بارود خان بے گناہ تھا اور اسے اپنی سازش میں پھانسنے والا فرید الدین۔۔ تھا جو کہ فلوری کا اصل قاتل تھا۔ مجھے ان باتوں پر سو فیصد یقین تھا۔ اگر مجھے بارود خان کے بے گناہ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو میں یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیتا ہی نہیں مگر عدالت میں میرے یقین کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مجھے یہ سب ثابت کرنا تھا اور اسی کیلئے میں اب تک محنت کر رہا تھا جس میں اپنی توقع سے زیادہ مجھے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ فرید الدین نے بھی فلوری کو ارادتاً باقاعدہ کسی منصوبے کے تحت قتل نہیں کیا تھا بلکہ وہ ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہو کر اس سچویشن کا حصہ بن گئی تھی جو وقوعہ کے روز فرید الدین کے کمرے میں پیش آئی تھی۔ بعد ازاں اس بلیک اینڈ وائٹ پینٹنگ کو رنگین بنانے کیلئے فرید الدین نے بارود خان کا کردار بھی اس میں شامل کر دیا تھا اور پولیس کو بھی اچھی خاصی رقم دے کر اپنی راہ کو ہموار کر لیا تھا۔ جج نے آئندہ پیشی کیلئے دس دن بعد کی تاریخ دی تھی۔

دوسرے روز فرید الدین۔۔ میرے دفتر میں موجود تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس کی آمد کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا۔ "کیا بغیر کسی وجہ کے میں آپ کے دفتر میں نہیں آ سکتا؟"

میں نے کہا۔ "میں آپ کی مخالف پارٹی کا وکیل ہوں۔ آپ کی یہاں آمد کا کچھ نہ کچھ مقصد تو ہو گا ورنہ اس نفسانفسی کے دور میں اتنی فرصت کس کے پاس ہے کہ یونہی منہ اٹھائے بغیر مقصد دفتروں میں گھومتا پھرے۔"

اس نے میرے انداز کا برا نہیں منایا بلکہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "کیا ہمارے درمیان کچھ دوستی نہیں ہو سکتی؟"

"میرا خیال ہے کہ ہمارے درمیان کبھی دشمنی نہیں رہی بلکہ کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اس کیس نے اگر کوئی تعلق پیدا بھی کیا ہے تو وہ ناخوشگوار ہے۔ میں اسے خوشگوار تعلق میں چاہتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے بظاہر دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

وہ سمجھا کہ میں اس کی باتوں میں آ گیا ہوں۔ راز دارانہ انداز میں بولا۔ "ہمارے درمیان اگر کوئی سیٹل منٹ ہو جائے تو تعلقات خودبخود خوشگوار ہو جائیں گے۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے فیصلہ کیا کہ اسے ذرا گھس کر دیکھنا چاہئے۔ "کیسا سیٹل منٹ۔"

اس نے اچانک پٹڑی بدل دی۔ "آپ واقعی بہت اچھے وکیل ہیں۔"

"تعریف کا شکریہ۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ کسی خوشگواریت کی بات کر رہے تھے؟"

"دیکھیں بیگ صاحب' میں گھماؤ پھراؤ کے بجائے صاف اور سیدھی بات کرنے کا عادی ہوں۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "یہاں آمد کا مقصد یہ ہے کہ آپ سے دو ٹوک معاملات طے کر لئے جائیں۔ آپ نے مجھے بہت بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔۔ میرا مطلب ہے' آپ کی جرح نے۔"

میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ "میں کچھ کچھ تو سمجھ رہا ہوں مگر ذرا وضاحت کریں۔"

"آپ کچھ کچھ نہیں' بہت کچھ بلکہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں بیگ صاحب۔"

اس نے مسکا لگایا۔ "آپ بہت ذہین وکیل ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ میں اس کیس سے آف ہونا چاہتا ہوں جیسے کبھی اس میں شامل تھا ہی نہیں۔"

"یہ تو بہت مشکل ہے' قتل بہرحال آپ کے کمرے میں ہوا تھا اور بدقسمتی سے کمرے میں آپ بھی موجود تھے۔"

"اس ملک میں سب کچھ ممکن ہے بیگ صاحب۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "نوٹوں میں بڑی قوت ہوتی ہے۔"

درحقیقت میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون سا منصوبہ لے کر میرے پاس آیا تھا اس لئے میں نے اس پر یہی ظاہر کیا کہ میں ایک لالچی وکیل ہوں اور کسی بڑی رقم کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اس طرح مجھے اس کے عزائم سے آگاہی ہو جاتی۔۔ جو آئندہ

عدالتی کارروائی میں بہت معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ میں نے بری طرح اسے اپنے شکنجے میں کسنے کا پروگرام بنا لیا تھا ورنہ وہ میرے پاس آنے کی زحمت نہ کرتا۔

میں نے کہا۔ ”آپ کھل کر بات کریں۔ یہاں کوئی غیر آدمی نہیں ہے۔“ ساتھ ہی میں نے آنکھ بھی ٹکا دی۔

وہ بولا۔ ”میری آفر بیس ہزار روپے کی ہے۔ بس کسی طرح اس مقدمے سے میری جان چھوٹ جائے۔“

”یہ تو بہت کم ہیں۔“ میں نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔

”آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”فرید الدین صاحب‘ میں جانتا ہوں کہ آپ نے فلوری کو دانستہ قتل نہیں کیا۔ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ کسی نازک لمحے کی لغزش کا سہارا لے کر فلوری آپ کو بلیک میل کرنا چاہتی تھی اور آپ۔۔۔“

اس کا رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ بہت نحیف آواز میں بولا۔

”آپ اتنی گہرائی میں اتر چکے ہیں؟“

”ایک ذہین وکیل کو کامیاب وکیل بننے کیلئے بعض اوقات اس سے بھی زیادہ حتیٰ کہ پاتال میں بھی اترنا پڑتا ہے۔“

وہ سراسیمہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ”آپ تو بہت خطرناک آدمی ہیں۔ آپ نے کہیں یہ گفتگو ریکارڈ کرنے کا بندوبست تو نہیں کر رکھا؟“

”میں وکیل ہوں‘ بلیک میلر نہیں۔“

”اوہ سوری‘ میں پریشانی میں ایک غلط بات کہہ گیا تھا۔“ وہ چہرے پر ندامت سجاتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے اپنی ڈیمانڈ نہیں بتائی؟“

میں نے کہا۔ ”جج کو اعتماد میں لئے بغیر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔“

”یہ کام تو آپ ہی کریں گے۔“ وہ دانت نکال کر بولا۔ ”میں تو صرف پیسہ پھینکوں گا۔“

”بس تو پھر آپ پیسوں کا بندوبست کریں۔“ میں نے کہا۔ ”آئندہ پیشی پر میں

جج سے بات کر رکھوں گا اور آپ کو اماؤنٹ بھی بتا دوں گا۔“

وہ خوش ہو گیا بہ الفاظ دیگر مجھے اپنے جال میں‘ اپنی دانست میں پھانسنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک امکان میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ ہو سکتا تھا وہ اپنے لباس میں کوئی خفیہ مائیکرو ٹیپ ریکارڈر چھپا لایا ہو اور مجھ سے اس قسم کی سودے بازی کر کے بعد میں مجھے بلیک میل کرنے یا اس گفتگو کا ٹیپ عدالت میں پیش کر کے کوئی فائدہ حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن میں نے خاص طور پر کچھ ایسی باتیں بھی کی تھیں کہ اگر بالفرض اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا بھی تو اب وہ اس ارادے سے باز آ جاتا۔ ویسے مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ میرے پاس ایسے مضبوط دلائل تھے کہ میں اس کے ہر ثبوت کو چٹکیوں میں اڑا سکتا تھا۔

اٹھنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! آپ نے آئندہ پیشی پر صفائی کے گواہ نصیبت خان کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس کا کیا بنے گا؟“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ میں سنبھال لوں گا۔“

”ویسے آپس کی بات ہے۔“ وہ سرگوشیانہ انداز میں بولا۔ ”نصیبت خان کس قسم کی گواہی دینے کا ارادہ رکھتا تھا وہ تو موقع واردات پر موجود بھی نہیں تھا؟“

میں نے کہا۔ ”نصیبت خان آپ کا ملازم ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا نہیں؟“

”پوچھا تھا‘ بہت پوچھا ہے مگر اس نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی جو میرے خلاف جاتی ہو۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ بطور صفائی کے گواہ کے اس کی آخر اہمیت کیا ہے؟ وہ ایسا کون سا راز اگل سکتا ہے کہ عدالت کے کمرے میں دھماکہ ہو جائے؟“

”آپ اپنے ذہن کو خواہ مخواہ نہ تھکائیں اور صفائی کے گواہ کو بھول جائیں۔ اب تو ہمارے درمیان دوستی ہو گئی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بیگ صاحب! لیکن میرے ذہن میں ایک الجھن سی رہے گی۔“ وہ باقاعدہ مجھے کرید رہا تھا۔

میں نے بات کو قہقہے میں اڑاتے ہوئے کہا۔ ”بس تو آپ اسے میرا ایک پروفیشنل سیکرٹ سمجھ لیں۔ آپ کاروباری آدمی ہیں‘ صحافت کے پروفیشن میں سالہا

سال سے ہیں۔ پروفیشنل سیکرٹ کو سمجھتے ہوں گے۔"

پھر میں نے دل میں کہا۔ "بچو تمہاری تباہی و بربادی کے دن آن پہنچے ہیں۔ تمہاری اپروچ' سورس اور پیسہ تمہیں نہیں بچا سکے گا۔ نصیبت خان تمہارے لئے مصیبت خان ثابت ہونے والا ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں آپ کو بیچ میں فون کرتا رہوں گا۔ آپ اپنا وزیٹنگ کارڈ عنایت کر دیں۔"

میں نے اپنا تعارفی کارڈ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "آپ یقیناً اس ڈیل کے بارے میں وکیل استغاثہ کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ قطعیت سے بولا۔ "وہ تو بالکل گدھا ہے۔ اگر اس میں گٹس ہوتے تو اس ڈیل کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔"

"اور ایک بے گناہ پھانسی چڑھ جاتا؟"

وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ "بیگ صاحب! یہاں ہر کوئی اپنی جان بچانے کے بارے میں سوچتا ہے' دوسرے کی کسی کو پرواہ نہیں ہوتی۔ ویسے بھی بارود خان جیسے لونڈے اس شہر کے سینے کا بوجھ ہیں۔ ایسے آوارہ اور اوباش لڑکوں کو تو جیلوں ہی میں بند رہنا چاہئے۔ خواہ مخواہ معاشرے میں گند پھیلاتے ہیں۔" اس کا لہجہ حقارت اور نفرت سے شرابور تھا۔

میں نے اس کے آلودہ خیالات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی۔ اس کے دل میں بارود خان کیلئے بے پناہ کینہ بھرا ہوا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے بے وقوف بنانے پر دل ہی دل میں کتنا مسرور ہے۔ میں نے اسے خوش ہونے دیا۔ اور بے گناہ بارود خان کی آہوں اور بددعاؤں کے سائے میں اسے رخصت کر دیا۔

○

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں نصیبت خان کھڑا تھا۔

آج صبح عدالت کے برآمدے میں جب فرید الدین سے ملاقات ہوئی تھی تو اس

نے سب سے پہلے اپنے کام کے بارے ہی میں پوچھا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ سماعت کے بعد۔۔ بات ہو جائے گی۔ وہ نصیبت خان کی گواہی پر معترض تھا۔

"بیگ صاحب' آپ نے تو کہا تھا کہ نصیبت خان کی گواہی کو روک لیں گے؟"

میں نے کہا۔ "آپ اسے ایک رسمی سی کارروائی کہہ لیں۔ میں چونکہ اس کا نام صفائی کے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کر چکا ہوں اس لئے یہ فارمیلٹی ضروری ہے۔"

"اسے فارمیلٹی ہی رہنا چاہئے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں نے نصیبت خان کو "سبق" یاد کرا دیا ہے۔"

وہ مطمئن تو نہیں ہوا مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سوال جواب کرتا' ہمارے کیس کی آواز پڑ گئی اور مجبوراً ہمیں وہاں سے ہٹنا پڑا تھا اور اب تمام متعلقہ افراد عدالت میں موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ نصیبت خان نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنے بیان کے طور پر ایک سنسنی خیز مختصر سی کہانی سنا دی۔

"جج صاحب! اگر ایک بے گناہ انسان کی زندگی موت کا سوال نہ ہوتا تو میں گواہی دینے ہرگز نہ آتا۔" نصیبت خان میٹرک تک پڑھا ہوا تھا اس لئے صاف اردو بولتا تھا۔ بارود خان اور اول خان کی طرح امارا تمارا نہیں کرتا تھا۔ میں نے دیکھا' فرید الدین مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔

تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر بولنے لگا۔ "گواہی کیلئے عدالت میں نہ آنے کی ایک خاص وجہ تھی اور وہ وجہ یہ تھی کہ اس سے میری ایک اخلاقی کمزوری بلکہ اخلاقی برائی کی نقاب کشائی ہو جاتی مگر ایک بے گناہ کی زندگی اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔" نصیبت خان کا انداز خالصتاً ڈرامائی تھا۔ "جناب عالی' میں یہ بتاتے ہوئے ہت شرمندگی محسوس کر رہا ہوں کہ میں اکثر باس کے بند کمرے میں تاکا جھانکی کیا کرتا ا خصوصاً" اس وقت جب وہ اپنی سیکریٹری کے ساتھ اندر موجود ہوتا تھا اور اس رکت کے دوران میں' میں نے وہ نظارے دیکھے کہ بس اللہ معاف کرے۔"

فرید الدین کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہوئے اور وہ خونخوار نظروں سے

نصیبت خان کو دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "جناب! میں نے اپنی اس کارروائی کیلئے ایک جگہ مخصوص کر رکھی تھی جہاں میں سگریٹ پینے کے بہانے کھڑا رہتا تھا چونکہ اس طرف کسی کا عام طور پر گزر نہیں ہوتا تھا اس لئے مجھے اس تماشہ بینی کا خاصا وقت مل جاتا تھا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے کہنا شروع کیا۔ "فرید الدین کے دفتر کی ایک کھڑکی عقبی بالکونی میں کھلتی ہے جہاں کوڑا اور کاٹھ کباڑ پڑا رہتا ہے۔ فرید الدین کی میز اس کھڑکی کے نزدیک ہی ہے۔ (واضح رہے کہ اس زمانے میں آج کل کی طرح چھوٹے موٹے شام کے اخبارات کے دفاتر ایئر کنڈیشنر جیسی سہولیات سے مزین نہیں ہوتے تھے۔ چونکہ موسم کا مقابلہ پنکھوں کی مدد سے کیا جاتا تھا اس لئے کھڑکیاں کھلی رکھنا مجبوری تھی)۔

"وقوعہ کے روز ویسے تو میں نے دفتر سے چھٹی کر لی تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس وقت دفتر میں مقتولہ فلوری اور باس فرید الدین کے سوا اور کوئی نہیں تھا اس لئے اس روز میری "تفریح" کا زیادہ چانس تھا۔ میں بظاہر تو دفتر سے نکل گیا مگر بلڈنگ کا ایک چکر لگانے کے بعد اپنی "کمین گاہ" میں پہنچ گیا۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ کمرے کے اندر مجھے دیکھا نہیں جا سکتا تھا جبکہ میں کسی حد تک اندر کا نظارہ کر سکتا تھا۔ میں اس زاویے کی اچھی طرح وضاحت نہیں کر پا رہا ہوں۔ ویسے میں بہت محتاط تھا۔ زیادہ تر اندر سے آنے والی آوازوں پر ہی گزارہ کرتا تھا کیونکہ پکڑے جانے کی صورت میں میری یہ تفریح ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاتی اور بے عزتی جو ہوتی وہ الگ۔" اس دوران میں فرید الدین غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔

ایک لمحے کو رک کر اس نے حلق تر کیا پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وقوعہ کے روز میں نے سنا' فرید الدین اور فلوری کے درمیان کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ پھر تکرار کی وجہ میری سمجھ میں آنے لگی۔ مقتولہ فلوری غصے میں اسے بتا رہی تھی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے اس لئے فرید الدین اس سے شادی کر لے مگر فرید الدین ٹالنے والے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نتیجے کے طور پر فلوری کی آواز بلند سے بلند تر ہونے لگی اور وہ چیخ چیخ کر فرید الدین کو برا بھلا کہنے لگی۔ پھر ان میں ہاتھا پائی کی سی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے تجسس سے مجبور ہو کر اپنے مخصوص محتاط انداز میں کمرے کے اندر جھانکنا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا' وہ آپس میں دست و گریبان تھے۔ پھر فرید الدین نے فلوری کو دور ہٹانے کیلئے زور دار جھٹکا دیا۔ وہ لہرائی اور اس کا سر میز کے کونے سے ٹکرایا پھر وہ کمرے کے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ ایک دم بے حس و حرکت تھی۔ فرید الدین اس کے وجود کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا مگر اس میں کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ شاید سر میں لگنے والی چوٹ شدید تھی اور فلوری بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس وقت میری جانب فرید الدین کی پشت تھی اس لئے میں ذرا زیادہ دیدہ دلیری سے اندر جھانکنے لگا۔

"جب فرید الدین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور کوشش کے باوجود بھی فلوری کو ہوش نہیں آیا تو فرید الدین نے بے حس و حرکت فلوری کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر اپنی میز کے نیچے رکھ دیا۔ اسکی میز خاصے بڑے سائز کی تھی اور تین طرف سے بند تھی' صرف بیٹھنے والی سائڈ سے یعنی دائیں بائیں کی درازیں چھوڑ کر درمیان سے کھلی تھی یوں اس کنگ سائز میز کے نیچے ایک چھوٹا سا چیمبر بن گیا تھا۔ فلوری کو اس چیمبر میں ڈالنے کی وجہ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کارروائی سے فارغ ہو کر فرید الدین ملحقہ باتھ روم میں گھس گیا۔

"اسی وقت کمرے کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے واضح طور پر یکھا' کمرے کے ملحقہ باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا مگر فرید الدین برآمد نہیں وا۔ دو تین بار دستک دینے کے بعد آنے والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور سے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ بیروں والا مخصوص کوٹ پہنے ملزم بارود خان تھا جس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ بارود خان نے چوکنا نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا' لھانے کی ٹرے کو میز پر رکھا' کچھ اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا اور جلدی سے ہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی ملحقہ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور فرید الدین باہر آ گیا۔ ں کے بعد جو کچھ ہوا' وہ انتہائی حیرت انگیز تھا' کم از کم میں تو اس کی توقع نہیں کرتا ا۔

"فرید الدین نے جلدی سے بے ہوش فلوری کو میز کے نیچے سے نکالا اور اسے وفے پر اس طرح بٹھا دیا جیسے وہ آرام کرنے کیلئے نیم دراز ہوئی ہو۔ پھر اس نے

ایک دراز میں سے ریوالور نکالا اور پے در پے دو گولیاں فلوری کے سینے میں اتار دیں۔ اس کے ساتھ ہی فلوری کا جسم خون اگلنے لگا مگر وہ بدستور بے حرکت پڑی رہی یا ممکن ہے اس کے جسم میں کوئی معمولی حرکت ہوئی ہو مگر میں اتنے فاصلے سے واضح طور پر دیکھ نہیں سکا ہوں۔ فرید الدین نے جلدی سے ریوالور پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کئے اور ریوالور فرش پر پھینک دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا' یہ دیکھنے کیلئے میں وہاں ٹھہرا نہیں اور فوری طور پر بلڈنگ سے نکل گیا۔"

نصیبت خان کا بیان ختم ہوا تو فرید الدین کی حالت دیدنی تھی۔ اس نے عدالت کے وقار کا بھی خیال نہیں رکھا بولا۔ "حرام زادے' سور کے بچے' نمک حرام تو اتنے عرصے سے یہ گل کھلاتا رہا تھا اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ چھپ چھپ کر تو میری پرائیویٹ لائف میں جھانکتا تھا' کیا دیکھتا تھا وہاں؟ فلوری کوئی تیری ماں بہن تھی۔ میں تجھے زندہ۔۔۔"

"آرڈر آرڈر۔۔۔" جج نے غصیلے لہجے میں کہا۔ مگر فرید الدین پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شاید غصے اور ناکامی کی شدت میں وہ حواس کھو بیٹھا تھا۔

وہ کف اڑاتے ہوئے دہاڑا۔ "بیگ کے بچے' تو نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں تجھے بھی اچھی طرح سمجھ لوں گا۔"

اس کے بعد وہ باہر کی جانب لپکا۔ جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو حکم دیا کہ پولیس کی مدد سے اس پاگل کو روکا جائے لیکن وہ کمرے سے نکل چکا تھا۔

عدالت کے کمرے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ حاضرین میں سے اکثر افراد اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ ایک بھگدڑ کا سا عالم تھا۔ اسی افراتفری میں باہر فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ پھر مسلسل فائرنگ ہوتی چلی گئی۔ جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہیں دبک گیا۔ چند لمحوں میں فائرنگ کی آواز آنا بند ہو گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا جو منظر میری نگاہوں نے دیکھا' اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ عدالت کے صحن میں تین پولیس اہلکاروں کی لاشیں خون میں ڈوبی پڑی تھیں۔ برآمدے کے ستون کے پاس فرید الدین بھی خون میں لت پت چاروں خانے چت پڑا تھا۔ ایک گولی اس کی کھوپڑی کو چیر کر دوسری جانب نکل گئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں اس خونین واقعے کی حقیقت آشکار ہو گئی۔ آج عدالت میں کسی نامی گرامی ڈاکو کی پیشی تھی۔ اس ڈاکو کے گروہ کے چار افراد نے اپنے ساتھی کو پولیس کے چنگل سے چھڑانے کیلئے یہ آپریشن کیا تھا اور پولیس والوں کی لاشیں گرانے کے بعد بڑی کامیابی سے اس ڈاکو کو آزاد کرا کر لے گئے تھے۔ شاید فرید الدین کی زندگی کو چاٹنے والی گولی ڈاکوؤں کی گنوں میں کہیں لوڈ ہو چکی تھی جو تقدیر اسے گھیر کر عدالت کے کمرے سے باہر لے گئی۔ شاید مقدرات اسی کو کہتے ہیں۔

ویسے وہ اگر ڈاکوؤں کی فائرنگ کا نشانہ نہ بھی بنتا تو اس کا بچنا پھر بھی ممکن نہیں تھا۔ کیس کا پانسا پلٹ چکا تھا اور بھری عدالت میں فرید الدین کا طیش کے عالم میں گواہ نصیبت خان کو برا بھلا کہنا ثابت کر چکا تھا کہ فلوری کا قتل اسی کے ہاتھوں سے ہوا تھا۔ اس حقیقت میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اسے کم از کم عدالت پھانسی کی سزا ضرور دیتی لیکن تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں' انہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ فرید الدین کی تقدیر میں مکافات عمل کا شکار ہونا لکھ دیا گیا تھا' دنیاوی عدالت اسے کس طرح سزا سنا سکتی تھی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میرے موکل بارود خان کو عدالت نے قتل کے الزام سے باعزت بری کر دیا۔ فرید الدین کو اچانک پیش آنے والا حادثہ بارود خان کیلئے خاصا مفید ثابت ہوا تھا کیونکہ بہرحال ویٹ اینڈ واچ والے معاملے میں عدالت اسے ضرور گھسیٹتی۔ اس نے گھڑی کی چوری کا اقرار جج کے روبرو کر لیا تھا۔ اگر مدعی زندہ ہوتا اور وہ چوری کے اس کیس کی پیروی کرتا تو تعزیرات پاکستان کی دفعہ تین سو اناسی کے تحت کم از کم تین سال کی سزائے قید تو بارود خان کو ہو ہی جاتی یا اسے جرمانے کی مد میں کچھ رقم ادا کرنا پڑتی۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا